ماہنامہ
آنکھ مچولی
کراچی
دسمبر ۱۹۸۸ء
بچوں کے ذوق کے انتخابات میں حصہ لیجئے
تفصیلات اسی شمارے میں ملاحظہ کیجئے

آپ ایک بار پی کر تو دیکھیں !
TAPAL
TAPAL TEA
DANEDAR
Leaf Blend
Net weight when packed
200 grams
TAPAL TEA
DANEDAR
ٹپال چائے
دانے دار
لیف بلینڈ
فوری تیار، زیادہ خوشبودار، گہری رنگت، یادگار لذّت، ایک پیالی میں گھنٹوں تسکین
MASS

ماہنامہ آنکھ مچولی

مُدیرِ اعلیٰ
ظفر محمود شیخ
مُدیرِ مسئول
تجمل حسین چشتی
مُشاورت
مشفق خواجہ، امجد اسلام امجد
مُدیرانِ اعزازی
طاہر مسعود
محمد سلیم مُغل
مجلسِ ادارت
شاہنواز فاروقی، سید خورشید عالم
خطاطی
عارف سعید

جلد	۳
شُمارہ	۶
دسمبر	۱۹۸۸ء
ربیع الثانی	۱۴۰۹ھ
قیمت	چھ روپے

زرِ سالانہ کے لیے خصوصی بچت اسکیم کا صفحہ دیکھیے۔

گرین گائیڈ اکیڈمی
ادارہ اشاعت برائے
تعلیم و تعمیرِ سیرتِ اطفال
زیرِ سرپرستی
ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن

ماہنامہ
آنکھ مچولی میں
شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جُملہ حقوق
بحق ادارہ محفوظ ہیں، پیشگی
اجازت کے بغیر کوئی تحریر
شائع نہیں کی جاسکتی

ماہنامہ
آنکھ مچولی
میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث
پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و
واقعات فرضی ہیں، کسی اتفاقیہ
مماثلت کی صورت میں
ادارہ ذمہ دار
نہ ہوگا۔

گرین
گائیڈ اکیڈمی
برائے خط و کتابت و مقامِ اشاعت ۱۱۲-ڈی، نورس روڈ سائٹ، کراچی

ناشر
ظفر محمود شیخ
طابع۔ زاہد علی • مطبع۔ لاریب
پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ، کراچی

سنسنی خیز اعلان

دہشت کی عظیم الشان دُنیا کو اپنے دامن میں سمیٹے بچّوں کے رسائل میں اپنی نوعیت کا اچھوتا اور منفرد

آنکھ مچولی کا **خوفناک نمبر**

جنوری ۸۹ء میں شائع ہو رہا ہے

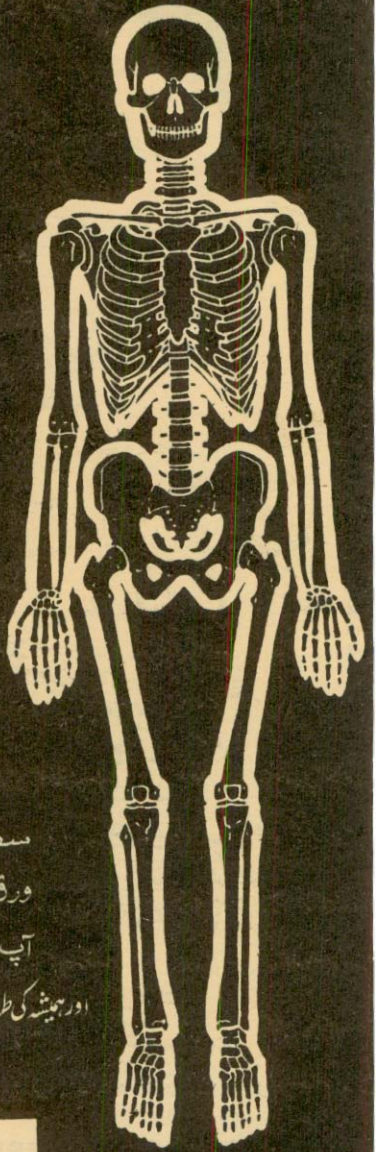

- دنیا بھر کے بچّوں میں مقبول خوفناک کہانیوں سے اہم انتخاب
- جنوں، بھوتوں، پریوں اور چڑیلوں کی دل ہلا دینے والی داستانیں۔
- ادب کے عالمی شہرت یافتہ خوفناک کرداروں سے آپ کی ملاقات
- خوف کے موضوع پر مستند افراد کے معلوماتی مضامین۔
- رونگٹے کھڑے کر دینے والی تصاویر۔
- مضبوط دل بچّوں کے دلوں کا امتحان لینے والے ڈراؤنے واقعات۔
- نیندیں اُڑا دینے والے اَن سُنے حادثات۔

اِس کے علاوہ اور بہت کچھ۔

سطر سطر خوف سے سنسناتی ہوئی،

ورق ورق ہیبت سے پھڑ پھڑاتا ہوا

آپ کے حافظے میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوجانے والا شمارہ

اور ہمیشہ کی طرح **خوفناک نمبر** کے ساتھ ایک خوب صورت تحفہ

مُفت

احتیاطاً اپنی کاپی آج ہی بُک کرا لیجیے

حُسنِ ترتیب

نشانِ عظمت — ادارہ — ۶
سندر بن کی سندر شیرنی — حارث شمیم — ۲۰
کھٹے میٹھے (منتخب لطائف) — منتخب لطائف — ۵۱
گنی چنی معلومات — عقیل عباس جعفری — ۸۵

اداریہ — ۷
نئی نسل کے نام (نظم) — اقبال راجہ — ۲۳
عکس — شاہ نواز فاروقی — سائنسی سلسلے وار ناول — ۵۵
میرا ایک رسالہ ہے (نظم) — محمد رضوان — ۸۹

ڈاک ڈاک کس کی ڈاک — خطوط کے جوابات — ۸
ماں میں تیرا شکر گزار ہوں — ابو مظفر زین — ۲۵
خراجِ تحسین (نظم) — محمد امان خان دل — ۶۱
روبوٹ کے ہنگامے — ایشان بن صفدر — ۹۰

اِس ماہ کا نام کیسے پڑا؟ — محمد اسلم شیخوپوری — ۱۱
اولمپک کا پاکستانی ہیرو (انٹرویو) — محمد سلیم مغل — ۲۹
بچوں کے قومی انتخاب — طاہر مسعود — ۶۳
سوال در سوال — ابو اسامہ — ۹۴

اونٹنی کا قتل — دیجنما سے ماخوذ — ۱۳
سورج مکھی لوگ — مہوش شکیل — ۳۸
موت کی وادی میں — سید نور شید عالم — ۷۱
بارش — محمد پرویز آذاش — ۱۰۰

قائدِ اعظم (نظم) — نفیس فریدی — ۱۴
کیا مرغی کیا نخرے — (ادارہ) — ۴۰
سائنس انکوائری — نیر ابدالی — ۷۶
نئی تحریریں — بچوں کی تحریروں کے انتخاب — ۱۰۳

خوشبو — تسنیم شکیل احمد — ۱۵
جادو کی چھڑی — سائنس فکشن — شین فاروقی — ۴۱
بچوں کے لیے ایک نظم — شین فاروقی — ۸۰
آؤ ملائیں ہاتھ — قلمی دوستی — ۱۱۵

مصور ہاتھی — ۱۹
بری گھڑی — احمد حاطب صدیقی — ۴۷
بندر کا غرور — سماعروج صدیقی — ۸۱
امی ابو کا صفحہ — مظفر بیگ — ۱۱۸

نشانِ عظمت

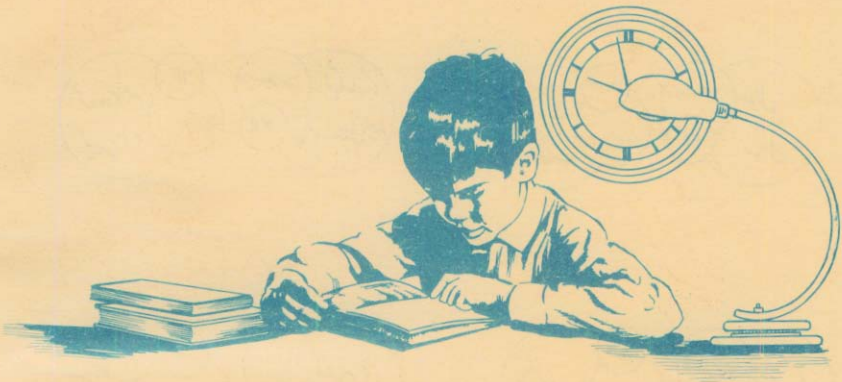

"وہ بڑا اچھا اور تیز لڑکا تھا" ـــــ فاطمہ بائی نے اپنے بیٹے کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"نیونہم روڈ کے گھر کی بالائی منزل پر ہم آٹھ افراد دو کمروں میں رہا کرتے تھے، رات کو جب بچے سو جاتے تو محمد علی جناح دفتی کا ایک تختہ لیمپ کے ساتھ کھڑا کر دیتے تاکہ روشنی سوئے ہوئے بچوں کی آنکھوں پر نہ پڑے اور پھر وہ رات گئے تک پڑھتے رہتے، ایک رات میں اُن کے پاس گئی اور کہا "بچے .... اتنا نہ پڑھا کر، بیمار ہو جائے گا۔" جناح نے جواب دیا "بائی" "اگر میں اب محنت نہ کروں گا تو زندگی میں بڑا کام نہ کر سکوں گا...."

(بحوالہ، محمد علی جناح۔ مصنف، ہیکٹر بولائتھو، ترجمہ: زُہیر صدیقی)

.... پُورے ملک میں انتخابی سرگرمیاں اپنے عُروج پر ہیں، دَر و دیوار پوسٹروں اور بینروں سے سجے ہوئے ہیں۔ عمارتوں پر رنگ برنگے جھنڈے لہرا رہے ہیں، موٹر کاریں حتیٰ کہ موٹر سائیکل اور سائیکلیں تک انتخابی جھنڈوں اور پوسٹروں سے سجی ہوئی ہیں۔ ایک جشن کا سماں ہے۔ جس شخص سے ملو انتخاب کی بات کرتا نظر آتا ہے، سیاست ہر ایک کا موضوعِ گفتگو ہے، تقریریں، جلسے، جلوس گہما گہمی۔ عجب میلے کا سا سماں ہے۔

یقیناً انتخاب بڑوں کا موضوع ہے لیکن طلبہ و طالبات جو وطن کی محبت سے سرشار ہیں اور قومی امور میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لینا چاہتے ہیں وہ بھی ان تمام سرگرمیوں سے بے نیاز ہو کر تو نہیں رہ سکتے، ہمارے ساتھی اتنی بہت ساری دلچسپ سرگرمیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہوں گے تو اُن کا جی بھی چاہتا ہوگا کہ وہ بھی انتخابات میں حصّہ لیں اور اپنے جذبات کا اظہار کریں مگر وہ ابھی ایسا نہیں کر سکتے، اس کی کئی وجوہات ہیں۔ ابھی آپ کی تعلیم کا سلسلہ جاری ہے اور یہ سب سے اہم ہے، ابھی آپ کی عمر کم ہے اور آپ ووٹ نہیں دے سکتے۔ ابھی آپ میں سے بہت سے ساتھی قومی سیاست کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے جس طرح بڑی عمر کے یا زیادہ علم رکھنے والے لوگ سمجھتے ہیں، ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ آنے والے وقتوں میں آپ ہی نے ملک کی باگ ڈور سنبھالنی ہے، آپ ہی نے قوم کی تقدیر بدلنی ہے اور ملک و ملّت کی ساری اُمیدیں آپ سے وابستہ ہیں، ہم نے سوچا ہے کہ جب آنے والی کل آپ ہی نے تعمیر کرنی ہے تو کیوں نہ ابھی سے اس کی تیاری کی جائے، بس یہ سوچ کر ہم نے آپ کے لیے انتخابات منعقد کروا دیے ہیں۔ "بچوں کے قومی انتخابات" کا آئینہ۔ اُمید ہے آپ کو پسند آئے گا اور آپ بڑھ چڑھ کر حصّہ لیں گے۔ یہی نہیں بلکہ ملکی انتخابات میں بھی آپ بڑوں کی راہنمائی کیجئے۔ اگر کسی کو کوئی غلطی کرتے دیکھیں تو انہیں سمجھائیں۔ ہم نے اس مقصد کیلئے ایک ضابطۂ اخلاق بھی شائع کیا ہے، اُسے بغور پڑھیے گا۔ بس ان پورے مرحلے میں ایک بات پیشِ نظر رکھئے گا کہ ہمارا مذہب اور ہمارا وطن ہماری بقا کا آخری حصار ہیں۔ اس پر کوئی حرف نہ آئے .....

اللہ تعالیٰ سے بھی بھر پور دُعا کیجئے کہ وہی لوگ قومی انتخابات میں کامیاب ہوں جن کے دل اسلام اور پاکستان کے لیے دھڑکتے ہیں۔

ڈاک ڈاک کس کی ڈاک

کاشف طاہر، ملیر توسیعی کالونی، کراچی ۔۔ آپ نے لکھا ہے کہ لطیفوں کا معیار گرتا جا رہا ہے۔ جبکہ چند دوسرے ساتھیوں نے ہمیں اس پر مبارک باد دی ہے کہ لطیفے تو بہت اچھے تھے البتہ دوسری تحریروں کے معیار پر توجہ دیجیے۔ ع کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔ اپنے پیارے دیس کے شہروں پر ہم پہلے ہی مقابلۂ مضمون نویسی کرا چکے ہیں اور اس کے انعام یافتہ مضامین چھپ چکے ہیں۔

طاہرہ وصی، ملتان کینٹ ۔۔ او ہو! آپ نے تو بڑی راز کی بات پوچھ لی۔ اس کا آسان سا جواب تو یہ ہے کہ آنکھ مچولی اتنی ہی تعداد میں چھپتا ہے جتنی تعداد میں بچے اُسے خریدتے ہیں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ آنکھ مچولی کی اشاعت پاکستان کے بہت سے روزناموں سے زیادہ ہے۔ اور بچوں کے رسالوں میں تو خیر اس کا نمبر آ گے ہی ہے۔ آپ کی اس بات سے ہمیں بالکل اتفاق نہیں کہ رسالے کے نکالنے والوں کی تصویریں اور انٹرویو شائع کیے جائیں۔ بھئی یہ رسالہ ہم نے آپ لوگوں کی حوصلہ افزائی کے لیے نکالا ہے اپنی شہرت مشہوری کے لیے نہیں۔

نذیر احمد رشید احمد، رادھا کشن، ضلع قصور ۔۔ آپ سخت ناراض ہیں کہ دو خط لکھے اور جواب ایک کا بھی نہیں ملا۔ اب بھلا یہ بتائیے ہم آپ کی کس بات کا جواب دیں۔ آپ کو کہانیاں پسند آئیں، شکریہ، آپ نے مصنفوں کو مبارک باد دی سو وہ پہنچا دی جائے گی۔ رہی آپ کی تجویز اس پر ہم غور کریں گے۔

عبدالرحمٰن قریشی، فاضلپور ۔۔ جناب آپ غُربت کی دھمکی نہ دیجیے ہم آپ سے زیادہ غریب ہیں اتنے پیسے بھی نہیں ہوئے کہ آپ کو بذریعہ ڈاک جواب دے سکیں اسی لیے تو آپ کو شکایت ہوئی ہے۔ یہ تو رہی مذاق کی بات۔ اصل بات یہ ہے کہ آپ کے خط میں کوئی ایسی بات ہی نہ تھی کہ جواب دیا جاتا۔

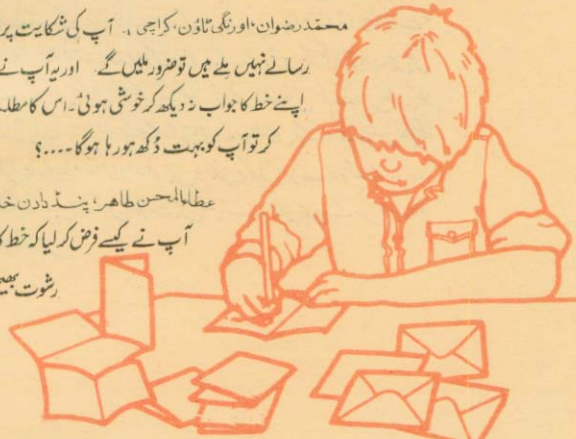

محمد رضوان، اورنگی ٹاؤن، کراچی ۔۔ آپ کی شکایت پر فوری تحقیق کی ہدایت کر دی گئی ہے۔ اگر رسالے نہیں ملے ہیں تو ضرور ملیں گے۔ اور یہ آپ نے خوب لکھا ہے کہ "نومبر کے شمارے میں اپنے خط کا جواب نہ دیکھ کر خوشی ہوئی"۔ اس کا مطلب ہے کہ اس وقت خط کا کا جواب پڑھ کر تو آپ کو بہت دُکھ ہو رہا ہوگا....؟

عطاءالمحسن طاہر، پنڈ دادن خان، ضلع جہلم ۔۔ بھئی بہت خوب۔ یہ آپ نے کیسے فرض کر لیا کہ خط کا جواب حاصل کرنے کے لیے لگتا ہے کہ رشوت بھیجنی پڑے گی"۔ ایسی باتیں فرض نہیں کر لیتے اس پر فوراً یقین کر کے عملاً کر گزرتے ہیں۔ ہم تو سمجھ رہے تھے کہ آپ

سوں کی ٹوکری بھیجیں گے لیکن پھر خیال آیا کہ آموں کا موسم تو گزر گیا۔ چلیے اگلے موسم میں سہی۔ (مذاق کو سچ تو نہیں جان لیا؟)

فرحانہ جاوید۔ دھلی کالونی، کراچی۔ او ہو، اگر آپ کی شادی ہو گئی ہے اور آپ پھر بھی آنکھ مچولی پڑھتی ہیں تو اس میں شرمانے یا جھجکنے کی کیا بات ہے۔ ہمیں دیکھیے ہم تو بال بچوں والے ہو کر آنکھ مچولی نکالتے ہیں اور ہر ایک کو فریہ بتاتے ہیں۔ آنکھ مچولی کو آپ جیسے قدر دانوں کی ضرورت ہے۔

محمد اکرم سیالوی، تحصیل ننکانہ صاحب۔ آپ نے لکھا ہے کہ بڑی محنت سے نظم "رسٹ وایچ" بھیج رہا ہوں.... کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ نظم کے بجائے رسٹ وایچ ہی بھیج دیتے "خیر کوئی بات نہیں۔ نظم اچھی ہوئی تو مجبوراً شائع کرنی ہی پڑے گی اور وہ بھی شکریے کے ساتھ۔

نوید امجد، کشمیری گیٹ خضرو۔ پیارے بھائی! رسالے کی قیمت بڑھاتے ہوئے ہم بھی خون کے آنسو روئے تھے۔ ہمیں احساس ہے کہ آنکھ مچولی کو غریب بچے بھی پڑھتے ہیں، لیکن بتائیے، ہم کیا کریں۔ کاغذ کی قیمت اتنی بڑھ چکی ہے کہ اس معیار اور گیٹ اپ کے ساتھ پانچ روپے میں رسالہ دینا ممکن نہیں رہا۔ امید ہے ہماری مجبوریوں کو آپ سمجھیں گے۔

عابد حسین، لالہ ٹاؤن۔ بھئی ہم تو خطوں کا جواب دیتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ خط لکھنے والا شہری بابو ہے یا معصوم دیہاتی.... اور ہمیں تو ویسے بھی دیہاتی لوگ زیادہ بھلے لگتے ہیں۔ پیارے پیارے بھولے بھالے۔ آپ کی ارسال کردہ کہانی فائنل میں ہے۔ ....انتظار کیجیے۔

رئیس احمد، پشاور۔ آہا، حسبِ عادت ایک "نئی تجویز" کے ساتھ آپ ہماری محفل میں آئے ہیں... مبارک، سلامت، آئیے آئیے، کہیے کیسا مزاج ہے... کیا؟ اشتیاق احمد صاحب سے انسپکٹر جمشید کے متعلق سلسلہ وار کہانی لکھوائیں.... بھئی اشتیاق احمد صاحب کی تحریر پڑھنی ہے تو اُن کے ناول پڑھ لیجیے۔ ہم سے تو آپ کوئی ایسی فرمائش کیجیے جو مارکیٹ میں موجود نہ ہو.... او ہو آپ تو روٹھ گئے.... بھئی سُنیے تو سہی کہاں چلے۔

محمد ریاض رضا، چاندنی چوک کراچی۔ اچھا تو آپ اور ضیاء الدین گہرے دوست ہیں اور آپ دونوں آدھے آدھے پیسے ملا کر آنکھ مچولی خریدتے ہیں۔ آپ کی دوستی اور بھائی چارہ قابلِ رشک ہے۔ بچپن میں ہم نے بھی ایسا ہی ایک تجربہ کیا تھا لیکن ہمارا دوست ہم سے آدھے پیسے لے کر گیا تو آج تک نہیں لوٹا.... آہ! میرے پیسے....

الطاف احمد قریشی، داؤد۔ کیا کہا آپ نے؟ ہم داؤد کے بچوں سے ڈرتے ہیں؟ کیوں کیا داؤد کے بچے "داؤد" ہیں؟ بھئی کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ.... داؤد کے بچوں سے تو ہمیں بہت پیار ہے۔ اگر کبھی وہ ہمیں ملیں گے نا تو ہم اُنھیں ٹافیاں کھلائیں گے۔ ڈر کی وجہ سے تھوڑے ہی۔ بس یونہی، ہم اصل میں بہت فیاض ہیں۔ تینوں شماروں کے لیے ۲۴ روپے کا منی آرڈر بھیجیے۔

ذیشان احمد ذکریا ذوالکفل، سرگودھا۔ عزیزم.... آپ کی طویل نظم کے چند بند پڑھنے کے بعد چند مشورے آپ کی خدمت میں.... ان پر ضرور توجہ دیجیے گا۔ آپ کی نظم کا مرکزی خیال نامناسب ہے۔ آپ کی نظم بحر اور وزن سے بالکل خارج ہے۔ ابھی آپ کو بہت مشق اور ریاضت کی ضرورت ہے۔

واجد محمود عباسی، راولپنڈی۔ "حق اسکواڈ" بازار میں دستیاب ہے۔ دس روپے کا منی آرڈر بھیج کر ہم سے بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ "عکس" ناول کی ابھی ابتدا رہے، فیصلے میں عجلت نہ کیجیے۔

ثمر زہرا بٹ، سعدیہ زہرا بٹ، منگلا کینٹ ۔ آپ نے انیس الرحمٰن کی نظم 'درخواست' کو چوری کی نظم قرار دیا ہے۔ بھئی دیکھیے ہمارے لیے یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ ہر تحریر چھاپنے سے پہلے اس کا اشتہار دیں اور یہ اطمینان کرلیں کہ آیا یہ پہلے کہیں چھپ تو نہیں چکی۔ ہم تو اپنے لکھنے والوں کی دیانتداری پر اعتماد کرتے ہیں.... اب وہ ہمارے اعتماد کو دھوکہ دے دیں تو ہمارا کیا قصور؟

ثناء محمد نصراللہ، میٹروویل کراچی ۔ کہانی "جج اکبر" کی اس غلطی کی جانب آپ کے علاوہ کچھ اور ساتھیوں نے بھی توجہ دلائی ہے کہ کہانی کار نے شروع میں لکھا کہ یہ اس زمانے کی بات ہے جب بسیں اور گاڑیاں نہیں ہوتی تھیں اور آگے چل کر بتایا گیا ہے کہ کہانی کے کردار کو ایک ٹرک نظر آگیا.... ہمیں خوشی ہے کہ آنکھ مچولی کے ساتھی نہایت ذہین ہیں اور انھوں نے بڑی باریک غلطی پکڑلی۔ سچ پوچھیے تو یہ آپ کی ذہانت کا امتحان تھا.... مبارک ہو کہ آپ اس امتحان میں کامیاب ہوئے۔

البیلا، گھوٹکی، سکھر ۔ بھئی ہر سوال کے جواب دینے کا ایک مناسب وقت ہوتا ہے.... اس وقت کے گزر جانے کے بعد جواب کی ضرورت نہیں رہتی.... اب اگر آپ کسی سوال کا جواب دینا بھول گئے ہیں تو اس بات کو بھی بھول جائیے۔ آپ کے سوال و جواب والی تجویز اچھی ہے.... اس پر غور کیا جائے گا۔

ارشد عمران ارشی، مسلم ٹاؤن، پنڈ دادنخان ۔ آپ تو ابھی سے سالنامے کے تحفے کی فکر میں مبتلا ہوگئے.... مطمئن رہیے، تحفہ اچھا ہی ہوگا.... اور تحفہ خواہ کیسا ہی ہو، اچھا ہی ہوتا ہے.... کیوں؟

جاوید اقبال عمران، چکوال ۔ ہاکی کی ٹیم پر اتنا غصہ.... بھئی ہار جیت تو ہوتی رہتی ہے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ جیت تو ہمیں اچھی لگتی ہے اور ہارنے پر ہم چراغ پا ہوجاتے ہیں۔ اسپورٹس مین اسپرٹ اسی کو کہتے ہیں کہ ہار کو بھی خوش دلی سے قبول کیا جائے۔

اسے ضرور پڑھ لیجیے!

بعض کُتب اور رسائل میں اکثر ایسی بہت سی معلومات یا معلومات پر مبنی تحریریں شائع ہوتی رہتی ہیں، جن کا کوئی مُستند یا مُعتبر حوالہ نہیں ہوتا اور تحقیق پر پتا چلتا ہے کہ ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان معلومات یا واقعات، کو محض کُتب یا رسائل میں شائع ہوجانے کی وجہ سے مستند سمجھ لیا جاتا ہے اور یہ ایک سے دوسرے تک اس طرح منتقل ہوتی رہتی ہیں کہ غلط ہونے کے باوجود علم کا حصہ بن جاتی ہیں۔ "آنکھ مچولی" نے معلومات کو اُن کی مکمل صحت کے ساتھ اپنے قارئین تک پہنچانے کے لیے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ وہ ایسی معلومات کی اشاعت سے گریز کرے گا جن کا کوئی مستند حوالہ نہیں ہوگا۔ ہمیں اپنے ساتھیوں سے بھی یہی کہنا ہے کہ وہ جب بھی کوئی معلوماتی تحریر، معلومات عامّہ یا تراشے کی شکل میں کوئی معلومات بھیجیں تو اُس کے ساتھ اُن کُتب یا رسائل کا حوالہ ضرور دیں، جہاں سے ان معلومات کو اخذ کیا گیا ہے۔ غیر مستند معلومات "آنکھ مچولی" میں شائع نہیں کی جاسکیں گی۔

اس مہینے کا نام کیسے پڑا؟

مُحمّد اَسلمؔ شیخوپوری

ربیعُ الثّانی

اسلامی سال کا چوتھا مہینہ ہے جیساکہ ہم ربیع الاوّل کے سلسلے میں بتلا چکے ہیں عربی زبان میں "ربیع"، موسم بہار کو کہتے ہیں اور "ربیع" کے معنیٰ ہیں انتظار کرنا اور اقامت کرنا اور "الثانی" کے معنیٰ ہیں دوسرا چونکہ ان دونوں مہینوں میں موسمِ بہار رہتا تھا اور ماہِ صفر کے مسلسل سفر اور لوٹ مار کے بعد وہ ان دو مہینوں میں اپنے گھروں میں قیام کرتے تھے اس لیے ان دو مہینوں میں سے پہلے مہینے کا نام ربیع الاوّل اور دوسرے مہینے کا نام ربیع الثّانی پڑ گیا۔۔۔

ان مہینوں کے ناموں سے آپ نے یہ بات ضرور محسوس کی ہوگی کہ عرب قوم انتہائی سادہ، فطرت پسند اور زندہ دل تھی۔ انھوں نے مہینوں کے نام اپنے حالات، تاریخی واقعات اور موسموں سے متأثر ہو کر رکھے۔ بادشاہوں، یا سرداروں کے نام پر انھوں نے کسی مہینے کا نام نہیں رکھا۔

قرآنی کہانی

اونٹنی کا قتل

شام حجاز اور القرن کے درمیان ایک وادی تھی یہاں ثمود نامی ایک قوم آباد تھی۔ جس بستی میں یہ قوم رہتی تھی وہ چاروں طرف سے انتہائی خوبصورت تھی۔ پہاڑوں کے طویل سلسلے میں ہر طرف ہریالی ہی ہریالی تھی طرح طرح کے میوے، ٹھنڈے پانی کے چشمے، یوں لگتا تھا جیسے جنت زمین پر اتر آئی ہے پوری قوم انتہائی چین اور آرام کی زندگی گذار رہی تھی۔ رفتہ رفتہ اس وادی کے باشندوں کے بچے بڑے ہوئے۔ جب یہ بچے جوان ہوگئے تو انہوں نے بے راہ روی اختیار کر لی خوب ہنگامے کرتے اللہ کی نافرمانیاں کرتے، مٹی کے بُت بنا کر ان کی عبادت کرتے اللہ تعالیٰ نے جتنی اچھی اچھی نعمتیں اور پھل انہیں دیئے تھے انہیں خوب مزے لے لے کر کھانے اور اللہ کا شکر ادا کرنے کے بجائے اس کی ناشکری کرتے رہتے۔ بستی میں ایک نیک دل بزرگ رہتے تھے۔

وہ ان نوجوانوں کو جمع کر کے بہت سمجھاتے کہ دیکھو خدا ایک ہے اور بڑی طاقت والا ہے۔ اگر ناراض ہو جائے تو سخت عذاب دیتا ہے۔ وہ تم سے سب کچھ چھین لے گا۔ یہ میوے، ٹھنڈے پانی کے چشمے، ہری بھری وادی سب کچھ برباد کر دے گا لہٰذا تم اس کی مہربانی کا شکر ادا کرو۔ جو شکر ادا کرے وہ اسے اور زیادہ دیتا ہے۔ تم اس کی نافرمانی چھوڑ دو وہ نوجوان کہتے کہ عجیب تمہارا خدا ہے نظر بھی نہیں آتا اور تم کہتے ہو بڑی طاقت والا ہے۔

ان نیک بزرگ نے ان نوجوانوں کو خوب سمجھایا مگر وہ نہ مانے اور اپنی من مانی کرتے رہے اُن کی اِن حرکتوں کا انہیں بہت دُکھ ہوتا تھا۔ انہوں نے پھر ایک مرتبہ کوشش کی سب کو جمع کیا اور سمجھانے لگے نوجوانوں نے ایک شرط لگا دی اور کہنے لگے اچھا ہم تمہارے خدا پر ایمان لے آئیں گے تم اپنے خدا سے کہو کہ وہ ایک اونٹنی پیدا کرے جس کا رنگ سُرخ ہو، آنکھیں بالکل کالی سیاہ ہوں، بہت موٹی ہو اور سب سے بڑی شرط یہ ہے کہ وہ اونٹنی اتنا دودھ دیتی ہو کہ پوری بستی کے لوگ اس کا دودھ پی لیا کریں۔

یہ بڑی عجیب و غریب قسم کی شرط تھی۔ وہ یہ شرط سن کر پریشان ہو گئے۔ آخر کار انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ ایسی شرط والی اونٹنی پیدا کر دے تاکہ یہ لوگ تجھ پر ایمان لے آئیں۔

اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی کام مشکل نہیں ہوتا کیوں کہ ہر چیز پیدا کرنے والا وہی ہے اس نے بالکل ہی ہی اونٹنی پیدا کر دی اب تو تمام بستی والے حیران رہ گئے ان میں سے کچھ تو اپنے وعدے کے سچے نکلے اور ایمان لے آئے اور کچھ اپنے وعدے سے مکر گئے اور دوبارہ بتوں کی پوجا کرنے لگے۔ یہ اونٹنی ایک دن پانی پیتی تھی اور دوسرے دن بستی کے دوسرے جانور پانی پیتے تھے۔ پوری بستی والے اس اونٹنی کا دودھ پیا کرتے تھے۔ ایک دن بستی کا سردار کہنے لگا اگر یہ لوگ اس اونٹنی کا دودھ پیتے رہے تو سارے بستی والے ان کی طرف ہو جائیں گے اور ڈر یہ ہے کہ سب مل کر انہیں اپنا سردار نہ بنا ڈالیں۔ سب نے کہا یہ تو ہو سکتا ہے ایک صحتمند نوجوان اٹھا اور کہنے لگا اس کا حل یہ ہے کہ اونٹنی کو قتل کر دیا جائے۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے بانسری سردار بہت خوش ہوا اور اونٹنی قتل کرنے کا کام اسی نوجوان کے حوالے کر دیا اور بہت سا انعام دینے کا وعدہ بھی کیا۔ نوجوان نے اپنے کئی دوست جمع کئے اور سب نے مل کر اس اونٹنی کو ذبح کر دیا۔ انہیں یہ خطرہ محسوس ہوا کہ انہیں اور ان کے ساتھیوں کو معلوم ہو گا تو وہ بہت ناراض ہوں گے چنانچہ سب نے فیصلہ کیا کہ ان کو بھی فوراً قتل کر دیا جائے۔ یہ نوجوان گھات لگا کر ایک پتھر کی آڑ میں بیٹھ گیا اور انتظار کرنے لگا کہ جیسے ہی وہ اتریں گے ان پر حملہ کر کے قتل کر دے گا۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ پہاڑ کے اوپر سے ایک پتھر لڑھکتا ہوا آنے لگا اس کے وزن سے کئی اور بھاری پتھر اکھڑ گئے اور سب اسی کی طرف لڑھکنے لگے۔ نوجوان نے جب یہ منظر دیکھا تو بھاگنے کے لئے چھلانگ لگا دی، لیکن اتنی دیر میں ایک پتھر اس کے سر پر آ گرا۔ نوجوان زخمی ہو کر نیچے گرا اور اتنے میں دوسرے پتھر بھی اس کے اوپر یکے بعد دیگرے گرتے چلے گئے اور وہ وہیں دب کر مر گیا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ بستی والوں نے اونٹنی کو قتل کر دیا تو انہوں نے بستی والوں سے کہا کہ اب تم سب تین دن میں ہلاک ہو جاؤ گے۔ پہلے دن تمہارے چہرے زرد ہوں گے۔ دوسرے دن سرخ اور تیسرے دن سیاہ ہو جائیں گے۔

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ دوسرے ہی دن ان لوگوں کے چہرے زرد ہونے لگے وہ سمجھ گئے کہ بزرگ صحیح کہتے تھے انہوں نے بہت معافی مانگی مگر خدا اس قوم سے سخت ناراض ہو چکا تھا اچانک زبردست زلزلہ آیا۔ بجلی کڑکنے لگی بستی والے بھاگنے لگے لیکن جس طرف وہ بھاگتے اُدھر کی زمین پھٹ جاتی اور وہ زمین میں دھنس جاتے۔

وہ بزرگ اپنا کہنا ماننے والے ساتھیوں کو لے کر محفوظ مقام پر چلے گئے اس طرح پوری بستی برباد ہو گئی یہ نیک دل شخص اللہ کے پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام تھے اور وہ اونٹنی اللہ کی اونٹنی تھی۔

اے قائداعظم

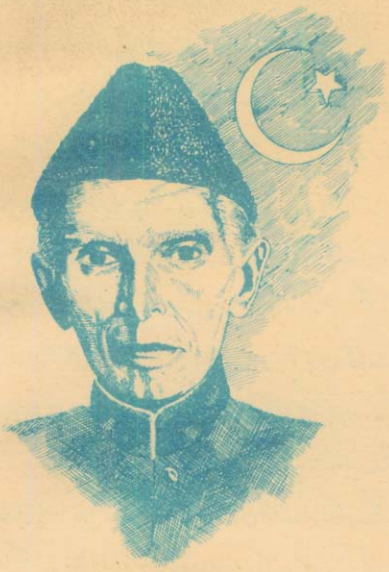

اے قائدِ اعظمؒ
اے قائدِ اعظمؒ
تُو ہی تو ہے اس ملکِ خداداد کا بانی
یہ پاک وطن ہے تیری عظمت کی نشانی
ہے فخر کہ ہیں تیری امانت کے امیں ہم
اے قائدِ اعظمؒ
ہے شاعرِ مشرقؒ کے حسیں خواب کی تعمیر
یہ پاک وطن آج ہے فردوس کی تصویر
اُڑتا ہی رہے گا تیری آزادی کا پرچم
اے قائدِ اعظمؒ
ہیں قوم کے رہبر تیرے افکار کے دھارے
بڑھتا ہے سفینہ تیری یادوں کے سہارے
ہے خوف تھپیڑوں کا نہ موجوں کا کوئی غم
اے قائدِ اعظمؒ

قائداعظمؒ کے ۱۱۲ ویں یومِ پیدائش پر نفیس فریدی کا تحفہ

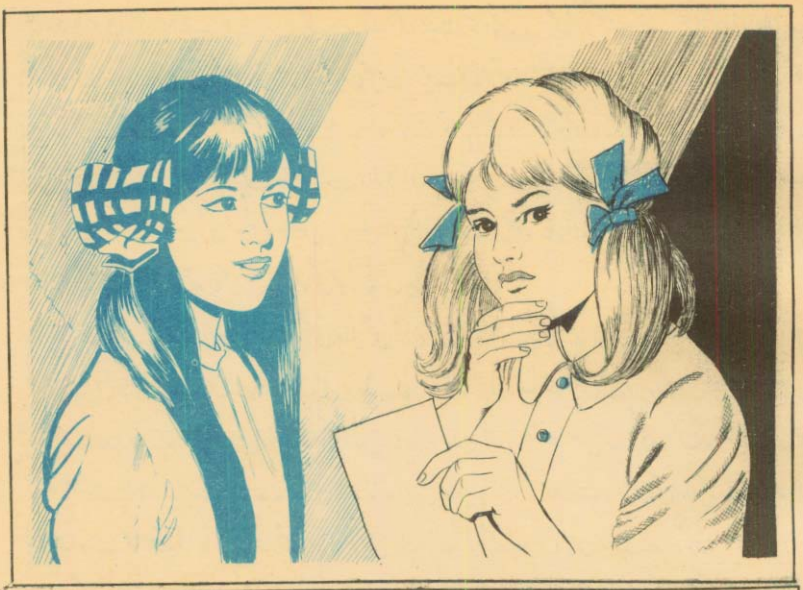

خوشبو

تسنیم شکیل احمد

ریحانہ کے گھر قرآن خوانی، محفل میلاد اور اُس کے بعد کھانے کی دعوت اختتام کو پہنچ چکی تھی۔ لوگوں نے بہت لطف اٹھایا تھا اور اب جب مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ ریحانہ اپنے بہن بھائیوں اور والدین کی موجودگی میں وہ تحائف کھول کھول کر دیکھ رہی تھی جو مہمان اُس کے لئے لے کر آئے تھے۔ دراصل آج کی یہ محفل اُس کے مڈل ایگزامینیشن کے امتحان میں اسکول میں اوّل آنے کی خوشی منعقد کی گئی تھی۔ لیکن ریحانہ کی زندگی کا تو یہ ایک انتہائی غیر معمولی واقعہ تھا۔ کیونکہ وہ ہمیشہ سے پڑھنے میں اتنی تیز نہیں تھی۔ پانچویں جماعت تک تو وہ رعائتی نمبروں سے پاس ہوتی رہی تھی۔ لیکن صرف دو سال میں ہی اس کی دنیا میں انقلاب آچکا تھا۔ اور اس قدر شاندار کامیابی اس کا مقدر بنی۔ یقیناً اللہ نے اُسے ذہانت اور اچھا دماغ عطا فرمایا تھا۔ لیکن اس سے پہلے وہ اُس سے کام نہ لے سکی تھی اور نہ ہی اُسے اس عطیہ کا احساس تھا۔

تمام تحائف کو کھول کھول کر وہ ایک جانب رکھتی جاتی تھی۔ کوئی سوٹ کا کپڑا تھا تو کوئی خوبصورت ڈیکوریشن پیس۔ اُس کے ماموں نے گھڑی دی تھی۔ چچا نے بہت خوبصورت کوٹ دیا تھا۔ ایک سہیلی موتیوں جڑا پرس لائی

تھی۔ تو دوسری سہیلی جگمگاتے ہوئے ہار اور بُندے۔ اور بھی بہت سی چیزیں رکھی گئی تھیں۔ سب ہی انتہائی دیدہ زیب مگر اُس نے جب اسمار کا تحفہ کھولا تو اُس میں کتابیں تھیں۔ ایک کا نام تھا۔ "بچّوں کے لئے قرآن" دوسری کتاب کا نام تھا "بچّوں کے لئے حدیث" ایک بڑے بڑے کارنامے انجام دینے والے لوگوں کے حالاتِ زندگی پر مشتمل کتاب تھی۔ ایک ڈکشنری تھی۔ ایک خوبصورت ڈائری اور ایک قلم۔ اُسے یہ تحفہ سب سے زیادہ پسند آیا تھا۔ دوسرے تمام تحفوں کو ملا کر بھی اُسے اتنی خوشی حاصل نہ ہوئی تھی جتنی اسمار کے تحفے سے اور کیوں نہ ہوتی یہ اس کی پیاری سہیلی اسمار ہی تو تھی جس کے ساتھ رہ کر اُس کی زندگی کا رُخ ہی بدل گیا تھا۔

پہلے وہ ایک کند ذہن اور بدسلیقہ بچّی سمجھی جاتی تھی۔ جس میں لوگوں کے خیال کے مطابق کسی قسم کی کوئی خوبی نہ تھی۔ آئے دن اس کو گھر میں والدین سے اور اسکول میں ٹیچر سے ڈانٹ پڑتی رہتی تھی۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک دن یہی ریحانہ اتنی تبدیل ہو جائے گی اور پڑھنے میں اتنے شاندار نمبر حاصل کرے گی۔ اس کی قسمت میں تو بس ڈانٹ پھٹکار اور لعنت ملامت ہی تھی۔ اور شاید ہمیشہ ہی ایسا رہتا مگر قدرت نے اُس کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور اسمار اپنے امّی ابّو باجی عائشہ اور ننھے بھائی اویس کے ساتھ اُس کے پڑوس میں رہنے کے لئے آگئی۔

اُسے آج سے ڈیڑھ سال پہلے کا واقعہ اچھی طرح یاد ہے اُس کے پڑوس میں جو نیا مکان کرائے کے لئے خالی تھا اُس میں تین چار روز سے لوگوں کی چہل پہل محسوس ہوتی تھی۔ لگتا تھا کرائے دار آگئے ہیں۔

ریحانہ کی امّی نے سوچا کہ نئے پڑوسیوں سے جاکر مل آئیں۔ اُس کی امّی جان کو نئی نئی سہیلیاں بنانے کا بہت شوق تھا۔ اس طرح ان کا وقت بہت اچھا گزر جاتا تھا۔ ان کا حلقۂ احباب بھی بہت وسیع تھا۔ کبھی وہ خود ہی کہیں چلی جاتیں۔ کبھی کوئی ان کے پاس آجاتا۔ اس طرح ان کے پاس اتنا وقت ہی نہیں بچتا تھا کہ وہ بچوں کی تربیت یا اُن کے مسائل کی طرف توجہ دے سکیں۔ بمشکل کھانے کی تیاری ہی مکمل ہو پاتی۔ ریحانہ کے ابّو تو آتے ہی سات آٹھ بجے تک تھے۔ اور اس قدر تھکے ہوئے ہوتے تھے کہ کھانا وغیرہ کھا کر اور اخبار دیکھنے کے بعد فوراً سو جاتے تھے۔ بچّوں کا شور و شغب ان سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے ان کے آنے کے بعد ہی اکثر ریحانہ اور کامران اِدھر اُدھر دبک جاتے تھے۔ امی ہی کھانے کے دوران دن بھر ہونے والی روداد، بچّوں کی بدتمیزیاں، کام کی زیادتی، تھکن اور مہنگائی وغیرہ کی بابت بتاتی رہتیں۔ ابو ہوں ہاں کر کے سنتے رہتے اور ساتھ ہی اخبار بھی پڑھتے رہتے۔ ریحانہ اور کامران کو تو بس دنیا بھر کے کھیلوں سے یا پھر ٹی وی سے دلچسپی تھی۔ سب سے زیادہ شوق تو انہیں وی سی آر پر فلمیں دیکھنے کا تھا۔ خواہ ان کی سمجھ میں کچھ آئے یا نہ آئے وہ تو بس وقت گزاری کے لئے دیکھتے رہتے۔ ظاہر ہے ان حالات میں پڑھائی کے لئے وقت کب ملتا اور کون توجہ دیتا۔

امی اور ریحانہ اسمار کے گھر پہنچیں تو کال بیل کے جواب میں ایک نہایت ہی پیاری سی بھولی بھالی بچی نے دروازہ کھولا۔ ریحانہ کی امی کو ادب سے سلام کیا۔ ریحانہ سے ہاتھ ملایا اور بہت احترام سے اکر ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ جاکر

امی کو اطلاع دی۔ اسمار کی امی جو ایک بے حد پروقار خاتون نظر آتی تھیں بہت ہی تپاک سے ملیں۔ ان لوگوں میں باتیں شروع ہوئیں تو اسمار اُٹھ کر کچن کی طرف جانے لگی تو ریحانہ بھی ساتھ ہی چل دی۔ کچن میں اُس کی باجی عائشہ موجود تھیں۔ اسمار نے ریفریجریٹر میں سے ایک ڈونگہ لاکر باجی کو دیا۔ ریحانہ نے دیکھا کہ اُس میں بیسن پہلے ہی تیار رکھا ہوا تھا۔ عائشہ باجی نے پکوڑے بنائے۔ ایک پیالے میں پودینا اور املی کی چٹنی رکھی ایک طرف چائے کا پانی رکھا دوسری طرف سوجی کا گرم گرم حلوہ تیار کیا۔ میوہ پہلے سے کٹا اور سوجی بھنی ہوئی رکھی تھی۔ اسمار ٹرالی اُٹھا لائی۔ اُس میں برتن سجا دیئے۔ اِدھر چیزیں تیار ہوئیں اِدھر چائے دم ہو چکی تھی۔ اسمار ٹرالی لئے امی کے پاس آئی۔ سب کو سلیقہ سے ناشتہ پیش کیا۔ اپنی پلیٹیں اٹھا کر اسمار اور ریحانہ ایک دوسرے کمرے میں آ بیٹھیں۔ بڑوں کے درمیان بیٹھ کر اُن کی باتیں سننا احترام کے خلاف تھا۔ یہ کمرہ عائشہ باجی اور اسمار کا تھا۔ ان کا اکلوتا بھائی اویس امی کے ساتھ ہوتا تھا ریحانہ نے دیکھا کہ اسمار کا کمرہ انتہائی سلیقہ اور نفاست سے سجا تھا ۲ عدد پلنگ جن پر صاف ستھرے بستر بچھے تھے۔ ایک پڑھنے کی میز دو عدد کرسیاں۔ ایک الماری جس میں ترتیب سے ہینگر میں کپڑے ٹنگے تھے۔ اور دوسری چیزیں قرینے سے رکھی ہوئی تھیں۔ ایک جانب ایک ڈسٹ بن رکھی تھی۔ جو خود ہی بنائی گئی تھی۔ عائشہ باجی کو کپڑے اور کاغذ کے بہت خوبصورت پھول بنانے آتے تھے۔ انہوں نے بہت ہی نفیس اور دیدہ زیب پھول اور گلدستے گھر میں مناسب جگہوں پر سجا رکھے تھے جو اس کمرے میں بھی اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ ایک طرف کتابوں کا ایک ریک تھا۔ جس پر صاف ستھری کتابیں مناسب انداز سے رکھی تھیں۔ سادگی کے ساتھ اس قدر نفاست ریحانہ تو حیران رہ گئی۔ بے اختیار بول اُٹھی "اسمار اتنی جلدی آپ لوگ سیٹ بھی ہو گئے"؟ اس کے لہجے میں بڑا تعجب تھا۔ اسے یاد آیا کہ دوسرے گھر میں جو کرائے دار آئے تھے وہ تو ہفتوں مختلف لوگوں سے چیزیں مانگ مانگ کر کام چلاتے رہے تھے کہ ابھی سیٹ نہیں ہوئے ہیں۔

"امی کہتی ہیں ٹرانسفر تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ہم جتنی جلدی سیٹ ہو جائیں اچھا ہے۔ تاکہ ہمارے نظام الاوقات میں فرق نہ پڑے۔"

اسمار نے جواب دیا۔

"کیا نظام الاوقات؟ میں سمجھی نہیں!" ریحانہ بھولپن سے بولی۔

اسمار بتانے لگی "دراصل امی اور ابو وقت کے بہت پابند ہیں۔ انہوں نے ہمارے پڑھنے کھیلنے، ملنے جلنے، کھانے اور گھومنے پھرنے کے اوقات مقرر کر رکھے ہیں۔ صبح نماز کے لئے اٹھنا پھر کچھ دیر کھلی ہوا میں سیر کرنا اس کے بعد ناشتہ کرنا پھر اسکول چلے جانا ہوتا ہے۔ اسی طرح واپس آکر کپڑے تبدیل کر کے کھانا کھانا ہوتا ہے۔ ظہر کی نماز کے بعد کچھ دیر آرام۔ اس کے بعد منہ ہاتھ دھو کر ہوم ورک کرنا ہوتا ہے۔ پھر ہمیں چھٹی ہے کہ کھیلیں

یا اگر کسی سہیلی کے پاس جانا ہو تو امی سے اجازت لے کر چلے جائیں۔ واپس آکر شام کے ناشتہ اور مغرب کی نماز تک گھر کے کچھ کام۔ مغرب کی نماز کے بعد اگلے دن کی پڑھائی سے متعلق کتابیں دیکھنا۔ یونیفارم وغیرہ اگر تیار کرنا ہو تو کر لینا۔ رات کا کھانا اور عشاء کی نماز کے کچھ دیر بعد سو جانا کیونکہ صبح جلد اٹھنا ہوتا ہے۔

ریحانہ تو یہ تفصیل سن کر بھونچکا رہ گئی۔ حیرت سے منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس ٹائم ٹیبل میں تو ٹی وی کا ذکر تک تھا۔ "تو کیا آپ ٹی وی بالکل نہیں دیکھتیں اسماء؟" اُس سے نہ رہا گیا اور پوچھ ہی بیٹھی۔

"ریحانہ میں بچوں کا پروگرام دیکھتی ہوں۔ معلوماتی اور ذہنی پروگرام بھی۔ ایسے تمام پروگرام دیکھتی ہوں جو میری عمر اور سمجھ کے مطابق ہوں۔"

"اگر کبھی ایسے وقت پروگرام آرہا ہو جب ہم ہوم ورک یا کوئی ضروری کام کر رہے ہوں تو وی سی آر میں ریکارڈ کر لیتے ہیں اور بعد میں دیکھ لیتے ہیں" اسماء نے تفصیل سے بتایا۔ اور اور بھی بہت سی باتیں بتاتی رہی۔ ریحانہ کو یہ تمام باتیں بہت نئی انوکھی لیکن بے حد دلچسپ لگ رہی تھیں۔ اور وہ ایک کہانی کی طرح بڑے شوق سے سُن رہی تھی۔

غرضیکہ جب ریحانہ اور اس کی امی گھر واپس آئیں تو وہ اسماء کی امی اور ان کے رکھ رکھاؤ اور خلوص و محبت سے بے حد متاثر نظر آتی تھیں۔ رفتہ رفتہ دونوں گھرانوں میں میل جول بڑھتا گیا۔ تو تکلف کی دیوار بھی گر گئی۔ اور دونوں گھرانے ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے۔ اسماء اور ریحانہ کی دوستی گہری ہوگئی۔ پھول اپنی خوشبو ضرور چھوڑتا ہے۔ جس طرح عطار کے پاس بیٹھنے سے کپڑوں میں عطر کی بھینی بھینی مہک ضرور بس جاتی ہے خواہ عطر خریدا جائے یا نہیں کیونکہ فضاء معطر ہوتی ہے۔ غیر محسوس طور پر ریحانہ اسماء کے طور طریقے سیکھتی چلی گئی۔ عائشہ باجی نے اس کو پڑھانا شروع کر دیا اور اس کی پڑھائی میں جو کمی رہ گئی تھی وہ بہت جلد پوری ہوگئی۔ آنٹی نے اس کا بہت حوصلہ بڑھایا۔ امی بھی اس کو اور کامران کو بہت وقت دینے لگیں۔ اُس کو توجہ صحت مند اور خوشگوار ماحول ملا تو اس کی صلاحیتیں نکھرتی چلی گئیں۔ اب وہ اکتائی ہوئی نہ رہتی۔ ٹیلیویژن اور وی سی آر میں پناہ نہ ڈھونڈتی۔ اُس کا تو خود ہی ہر بات کا ٹائم ٹیبل بن گیا تھا۔ اُسے وقت کی پابندی کی افادیت کا اچھی طرح احساس ہوگیا تھا۔ اُسے یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ وی سی آر فلمیں دیکھنے کے لئے نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ تو ایک مشین ہے جس کو انسان خود اپنی پسند اور سمجھ کے مطابق استعمال کرتا ہے۔ یہی حال دوسری چیزوں اور مشینوں کا بھی ہے۔ جن کو انسان کی عقل کے تابع ہونا چاہیئے اور اچھے مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہیئے۔

غرضیکہ اسماء کے پسندیدہ عادات و اطوار خوشبو بن کر ریحانہ کی شخصیت کو نکھارنے کا سبب بن گئے تھے۔ خدا کرے ہر گھر سے ایسی ہی خوشبو پھیلتی رہے اور ہمارے وطن کی فضائیں عطر بیز ہو جائیں۔ (آمین)

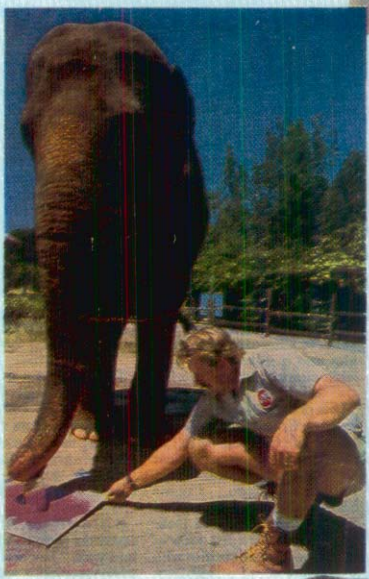

مُصوّر ہاتھی

انسانوں نے جب سے جانوروں جیسی حرکتیں کرنی شروع کی ہیں جانوروں نے جوابی کارروائی کے طور پر انسانوں جیسی حرکتوں کا آغاز کر دیا ہے۔ اب چلی کے "وائلڈ اینیمل پارک" کے اس ہاتھی ہی کو دیکھیے جو مصوری کرتا ہے اور "مصوّر ہاتھی" کہلاتا ہے۔ تاہم اس کا اصلی نام کیرول ہے۔ کیرول اب تک بے شمار تصویریں بنا چکا ہے۔ کیرول کی تصاویر کی فروخت سے چڑیا گھر والے اب تک تقریباً دو ہزار امریکی ڈالر یعنی تقریباً چھتیس ہزار روپے کما چکے ہیں۔ کیرول اگر انسان مصوّر ہوتا تو شاید ساری زندگی بھی اپنی تصویروں کی فروخت سے اتنے روپے نہ کما پاتا۔ کم از کم اگر ہمارے معاشرے کا رہنے والا ہوتا تو۔۔۔

آپ کا کیا خیال ہے؟

ذرا چپکے سے

بتا دیجیے۔

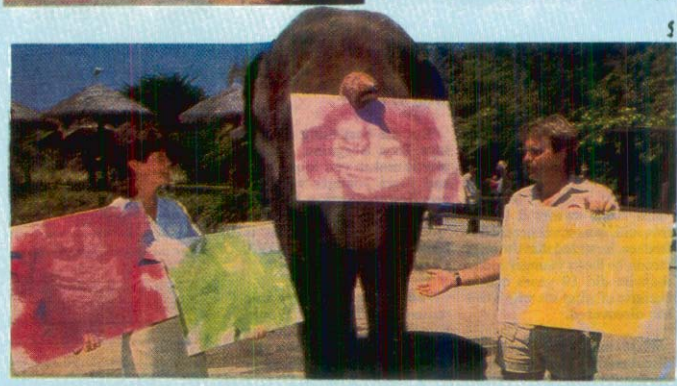

۱ ذرا گن کے تو بتائیے اس ٹرالی میں کتنے شیر ہیں؟ چھ یا آٹھ...

۲ کہیں ہمیں پانی ملا دودھ تو نہیں پلایا جا رہا؟

۳ فوٹو کھنچواتے وقت میں ذرا نروس ہو جاتا ہوں۔ ابھی عادت نہیں ہے نا!

۴ شیر کے بچّے کے ساتھ چہل قدمی کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔

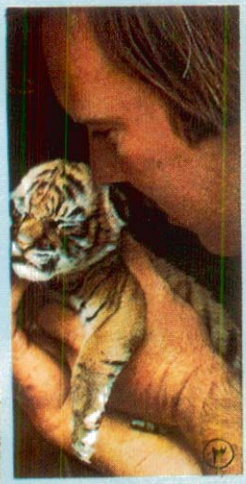

سُندر بن کی سُندر شیرنی

بنگال کی سرزمین جادو، قحط، سُندر بن اور سُندر بن میں پائے جانے والے شیروں کے حوالے سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ سُندر بن میں پائے جانے والے چیتے اپنی جسمانی خوبصورتی، پھرتی، عیاری اور خونخواری کی وجہ سے بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ ان کی شہرت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ برصغیر کی مختلف زبانوں میں شکاریات کے حوالے سے جو کہانیاں لکھی جاتی ہیں اُن میں سے بیشتر کہانیاں بنگال کے شیر کے شکار سے متعلق ہوتی ہیں۔ یوں تو بنگال کے شیر ایشیا کے دوسرے کئی خطوں میں بھی پائے جاتے ہیں لیکن بنگال میں ان کی کثرت ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بنگال میں پائے جانے والے شیر عرصۂ دراز سے دنیا بھر کے شکاریوں کی توجہ کا مرکز ہیں۔ ان شیروں کا شکار ہر شکاری کے لیے باعثِ فخر ہوتا ہے۔ بنگال کے شیر میں شکاریوں کی اسی خصوصی دلچسپی کا نتیجہ ہے کہ ان شیروں کی تعداد اب اتنی کم ہوچکی ہے کہ ان کی نسل کے ختم ہوجانے کا اندیشہ پیدا ہوگیا ہے۔

امریکی ریاست کیلی فورنیا کے ریڈ وڈ شہر کے چڑیا گھر میں بنگال کے شیر کی نسل کے تحفظ اور فروغ کے لیے خاص انتظام کیا گیا ہے۔ جس کے تحت کچھ عرصہ قبل بنگال سے شیروں کا ایک جوڑا لاکر اس چڑیا گھر میں رکھا گیا ہے۔ ان دو شیروں میں نر شیر کا نام "موہن" اور مادہ شیر کا نام "بغداد" ہے۔ بغداد اس وقت دنیا کی مشہور ترین مادہ شیر ہے۔ کیوں؟ ابھی بتاتے ہیں۔

مادہ شیر بغداد جنگل کے کھلے ماحول سے چڑیا گھر کے بند ماحول میں آئی تو اُسے شدید بے چینی کا احساس ہُوا۔ وہ اکثر اپنے نر شیر کے ہمراہ دہاڑتی ہوئی خندق سے گھرے ہوئے قطعۂ زمین پر گھومتی رہتی، لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ اس ماحول کی عادی ہوگئی یا یوں کہیے کہ اُس نے اپنے ماحول سے سمجھوتا کرلیا۔ چڑیا گھر میں آنے کے ایک سال بعد بغداد نے ایک ساتھ آٹھ بچوں کو جنم دیا۔ اور پوری دُنیا میں مشہور ہوگئی۔ عام طور پر مادہ شیر کے ہاں دو سے چار کے درمیان بچے پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب بغداد نے ایک ساتھ آٹھ بچوں کو جنم دیا تو بقول بغداد کے نگران کے "ایک وقت میں آٹھ بچوں کو دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے کھُلی رہ گئیں۔ یہ عالمی ریکارڈ ہے۔"

آٹھ بچوں کی پیدائش کے بعد بغداد کو بڑی مشکل کا سامنا ہوا۔ اُس کے آٹھ کے آٹھ بچے جب ایک وقت میں اُس کی طرف دُودھ پینے کے لیے جھپٹتے تو بغداد جھنجلا جاتی۔ اس صورتحال کو دیکھتے ہوئے چڑیا گھر کی انتظامیہ نے بچوں کو بوتلوں

سے دُودھ پلانے کا بندوبست کر دیا۔ بچّوں کو مصنوعی دُودھ اُس وقت تک دیا جاتا رہے گا جب تک وہ گوشت کھانے کے قابل نہیں ہو جائیں گے۔

ایک پورے شیر کا وزن عام طور پر چار سو پچھتر پاؤنڈ کے درمیان ہوتا ہے۔ جبکہ پیدائش کے بعد اُس کے بچّے کا وزن دو سے تین پاؤنڈ کے درمیان ہوتا ہے۔ شیر کے وہ بچّے جو چڑیا گھر کے بجائے جنگل میں پیدا ہوتے ہیں وہ پیدائش کے تقریباً ایک سال بعد تک ہر وقت اپنی ماں کے ساتھ گھومتے پھرتے اور اُسے شکار کرتا دیکھ کر شکار کرنے کا طریقہ سیکھتے رہتے ہیں۔ جنگل میں شیروں کے اکثر بچّے پیدائش کے بعد خوراک کی قلّت اور دوسرے جانوروں کا شکار بن کر ہلاک ہو جاتے ہیں۔

اِس وقت بغداد کے آٹھ میں سے سات بچّے زندہ ہیں۔ ایک بچّے پر بغداد اتفاقی طور پر کود گئی تھی جس کے باعث وہ ہلاک ہو گیا۔ بغداد کے یہ بچّے چڑیا گھر کے ایک خصوصی حصّے "ٹائگر آئس لینڈ" میں رہتے ہیں اور اپنا بیشتر وقت ایک دوسرے کے ساتھ کھیل کود کر گزارتے ہیں۔

یہ بچّے امریکہ کے کئی ٹی وی پروگراموں میں آکر شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ ان بچّوں کو چڑیا گھر کے کئی تعلیمی پروگراموں میں بھی شریک کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بچّے امریکہ کے مختلف اسکولوں میں بھی لے جائے جاتے ہیں تاکہ وہاں کے طلبہ و طالبات بنگال کے اِس خوبصورت چالاک اور خونخوار جانور کو قریب سے دیکھ کر اُس کے بارے میں معلومات حاصل کر سکیں۔

ماہنامہ آنکھ مچولی کا مقبول ترین سلسلۂ تحریر

اخلاق احمد کی مُہماتی کہانیوں کا دلچسپ مجموعہ

- بُرائیوں سے برسرِ پیکار ۴، کمسن مجاہدوں کے کارنامے
- ذہانت اور شجاعت سے بھرپور حیرت انگیز واقعات
- خوبصورت اسکیچز ــــ بہترین تصاویر ــــ اعلیٰ طباعت

حسین سرورق اور ۱۰۰ سے زائد صفحات

"حق اسکواڈ" حاصل کرنے کے لیے ۱۰ روپے کا منی آرڈر یا ڈاک ٹکٹ بھجوا دیں

نئی نسل کے نام

اقبال راجہ

اے اُلفت و ایثار کے بہتے ہوئے دھارو
اے روشنیٔ علم کے بے مثل منارو
اے علم کی دُنیا کے چمکتے ہوئے تارو
اے رہبرو، چارہ گرو اے مرے یارو
ہو تم کو مبارک یہ مقاصد کی بلندی
راس آئے تمہیں اپنے خیالات کی تُندی
اک روز جہالت کا اندھیرا نہ رہے گا
اور روشنیٔ علم کا خورشید چڑھے گا
ہو جائیں گے پُرنور در و بام جہاں کے
ذرّے بھی نظر آئیں گے خورشید یہاں کے
بس محنت و ہمت سے، اخوّت سے، لگن سے
ہر معرکہ سر کرتے رہو اپنی لگن سے

جہاں قالین وہیں صفائی

سنو وھائٹ

ڈرائی کلیننگ انڈسٹری، کراچی

ہیڈ آفس :

عبداللہ ہارون روڈ فون : ۵۱۱۷۱۱

شاخیں :

- بہادر آباد فون : ۴۱۳۶۹۵
- جمشید روڈ " ۴۱۱۳۰۲
- کھارادر " ۲۲۵۸۰۳
- گارڈن روڈ " ۷۲۲۴۳۳
- برنس روڈ ۲۰۳۳۳۶
- ڈیفنس فیز V فون : ۵۲۶۵۳۹
- امیر خسرو روڈ " ۴۱۳۶۹۵
- راشد منہاس روڈ " ۴۱۱۳۰۲
- حسن اسکوائر " ۵۲۶۵۳۹

سنو وھائٹ

ڈرائی کلیننگ انڈسٹری

ہیڈ آفس : عبداللہ ہارون روڈ، کراچی فون ۵۱۱۷۱۱ ۵۲۶۵۲۹

زونل آفس : صدر بازار۔ راولپنڈی فون ۶۷۹۸۸ ۹۳۲۵۰

ماں میں تیرا شکر گزار ہوں

ابُوظفر زین

دل کو چھُو لینے والی ایک اثر انگیز تحریر

کل میری ماں اس دُنیا سے چلی گئی ۔ اُس نے اپنے پیچھے دو قیمتی یادگاریں چھوڑی ہیں ۔ ایک میں اور ایک میری ہمّت ۔

ابھی میں ڈھائی سال ہی کا تھا کہ باپ کا انتقال ہو گیا ۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے میری ساری دنیا ایک لفظ ماں میں سمٹی ہوئی تھی ۔ وہی میری ماں بھی تھی اور باپ بھی ۔ میں نے اس کو پاکر سب کچھ پالیا ۔ کبھی کچھ حسرت نہ ہوئی ۔ ماں ! تیری محبّت سب سے بڑی نعمت ہے ۔ تیری خدمت سب سے بڑی خدمت ہے ۔

تیری خوشی سے جنّت اور تیری ناخوشی سے جہنّم ہے ۔ ماں ہو تو سب کچھ ہے ۔ ماں نہ ہو تو کچھ بھی نہیں ۔ تیری گود سکون کی بندرگاہ ہے ۔

اس کی ہر محبت میں عقل تھی ۔ اس کی ہر عقل میں محبت ۔ وہ ڈانٹتی بھی تھی اور کبھی کبھی مارتی بھی مگر مجھے عالیشان انسان بنا کر کھڑا کرنے کے لیے ۔ وہ جانتی تھی کہ دنیا میں ان جیسے نرم و نازک بچّوں کا گزر نہیں جو مشکلات اور امتحانات کی ہر چھُری سے کٹ جائیں ۔ وہ بچّے کو جہاز بناتی تھی ۔ وہ جہاز نہیں جو طوفان کے پہلے ہی تھپیڑے میں ٹوٹ جائے ۔ جائے ۔ بلکہ وہ جہاز جو طوفان اور آندھی کو اپنے حق میں استعمال کرے ۔

ماں ! میری مرحومہ ماں ! تو جانے ہی کو آئی تھی لیکن مجھے ہمّت اور عزّت سے جینا سکھا کر ۔ آج میں اس تلخ اور تُرش دنیا میں اکیلا ہوں لیکن یہ اعتماد رکھتا ہوں کہ آتی ہوئی مشکل کو دُور سے پہچان سکتا ہوں اور ہر مشکل ترقّی کا زینہ ہے ۔

میری ماں پڑھی لکھی نہ تھی ۔ اس کے پاس علم کی آنکھیں نہ تھیں لیکن عقل کی نگاہیں بھرپور تھیں ۔ وہ ایک غریب مفلس عورت تھی لیکن دل اور دماغ کی دولتوں سے کھیلتی تھی ۔ اس کے پاس ایک ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی تھی دریا کے کنارے ایک ٹوٹی پھوٹی بستی میں ۔ وہ مُرغیاں پالتی تھی اور بکریاں ۔ جن کی پرورش کے ساتھ ساتھ وہ اپنی اور میری بھی پرورش کیا کرتی ، غم اُسے چھُو کر نہیں گزرا تھا ۔ اس کے اندر خوشی ہی خوشی تھی ۔ مشکلات سے آگے بڑھ کر مقابلے کی طاقت تھی ۔ اُس نے یہ باتیں مجھ میں کُوٹ کُوٹ کر بھر دی ہیں ۔

دریا کے اُس پار ایک بند تعمیر ہو رہا تھا جس کا ٹھیکہ گوروں کی ایک بیرونی کمپنی نے لے رکھا تھا ۔ گوروں نے اپنی ایک کالونی ہی بسا رکھی تھی اور وہ بکری ، دودھ ، مرغی ، چوزہ ، انڈہ وغیرہ خوب خریدتے تھے اور خوب قیمت دیا کرتے مگر ہر شخص سے نہیں ۔ وہ چیز کی قدر و قیمت کو پہچانتے تھے لیکن اس سے پہلے بیچنے والے کی شخصیّت کو پہچانتے تھے ۔ گورے بڑے محنتی اور حفاکش تھے ۔ وہ ڈیوٹی سے اور وعدہ سے پیچھے نہیں ہٹتے تھے ۔ وہ اسی قسم کے آدمی کو پسند کرتے تھے ۔ وہ نہ بہانہ تلاش تھے نہ بہانہ تراش ۔ ان پر پورا بھروسہ کیا جا سکتا تھا اور اسی لیے وہ اس آدمی کو پسند کرتے جس پر پورا بھروسہ کیا جا سکے ۔ وہ لین دین میں بڑے ایماندار تھے اور کبھی جھوٹ نہیں بولتے تھے ۔ وہ خطرات مول لیتے تھے مگر معاہدہ پورا کرتے اور وہ آدمی بھی ایسا ہی ڈھونڈتے تھے ۔ میری ماں کی گوروں کی بستی میں بڑی قدر تھی چونکہ وہ ان کے مطلب کی شخصیّت تھی ۔ کبھی غلط وعدہ نہ کیا ۔ کبھی غلط مال نہ ٹرخایا ۔ مجھے یاد ہے جب میں پانچ سال کا تھا کہ میرے سر پر انڈوں یا چوزوں کی ٹوکری ہوتی تھی اور میری ماں کے ہاتھ میں بکروں اور بکریوں کی رسّیاں ۔ ہم دونوں کشتی سے صبح جاتے اور شام تک تمام مال بیچ کر واپس آجاتے اگر مانگو تو تمام میم اور مس صاحبان اپنے اپنے

آرڈروں کی قیمت پیشگی دینے کو تیار ہوتیں، لیکن میری ماں نے کبھی پیشگی قیمت نہیں لی۔

میں پانچ سال کا تھا۔ مجھے یاد ہے وہ دن جب میں صبح سو کر اُٹھا تو بارش تیز ہو رہی تھی۔ گرج اور چمک کے ساتھ۔ رات ہی سے کڑکا ہو رہا تھا۔ آسمان پر کالے کالے گھنگھور بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہر طرف اندھیرا سا تھا۔ ڈر اور ہَوَل کے مارے میں لحاف میں مُنہ چھپائے پڑا تھا لیکن ماں اُٹھ کر بے خوف و خطر کام کر رہی تھی۔ اچانک اُس کی کڑک دار ڈانٹ فضا میں دوڑ گئی ---" بیٹے! اُٹھ، منہ ہاتھ دھو۔ روٹی اور لسّی کھالے۔ چلنے کے لیے جلدی تیار ہو جا"۔

"ماں! مگر آج تو اتنی اندھیری ہے، اتنا پانی ہے۔ ایسی سردی ہو رہی ہے۔ میں تو کپکپا رہا ہوں۔ ماں کل چلیں گے"۔

"کام چور! ابھی اُٹھ کر کھڑا ہو۔ کیا تو اس ذرا سے بھیگے موسم سے ہمّت ہار جائے گا۔ کیا تجھے نہیں معلوم کہ آج میرا وعدہ ہے آٹھ بنگلوں میں مُرغیاں اور انڈے سپلائی کرنے کا۔ میم صاحبان مجھ پر آس لگائے ہوئے ہوں گی"۔

"اگر آج وہ مرغیاں اور انڈے نہیں کھائیں گی تو مَر نہیں جائیں گی"۔

"نالائق! ہمّت چور۔ مسئلہ ان کے جینے اور مَرنے کا نہیں ہے۔ مسئلہ ہماری زبان کے مرنے اور جینے کا ہے۔ میں ان سے آج کا وعدہ کر کے آئی ہوں۔ آج۔ آج۔ کیا تو چاہتا ہے میں اپنی زبان کی جھوٹی ہو جاؤں اور اُن کی نگاہ میں عزّت کھو دُوں۔ وہ عزّت جو میں نے اتنے برسوں میں جان دے دے کر بنائی ہے۔ اُٹھ جا۔ کیا تو ہمّت والی ماں کا بزدل بیٹا بننا چاہتا ہے"؟

ناچار اُٹھا۔ دل کڑا کیا۔ چھاچھ کے ساتھ روٹی کھائی۔ ٹوکری سر پر سنبھالی جس میں ماں نے ایک درجن چوزے اور تین درجن انڈے رکھ دیے تھے۔ ماں نے بھی چند بکریوں کی رسّیاں پکڑیں اور ہم دونوں اس برستے بادل اور کالی آندھی میں نکل پڑے۔ میں تو رونے لگا تھا۔

"چھی چھی" ماں نے ایک تیز ڈانٹ سُنائی "تو رو رہا ہے۔ اور یہ مُرغیاں نہیں روتی ہیں حالانکہ انہیں آج ہی ذبح ہونا ہے۔ دیکھ یہ چوزے تن بہ تقدیر ایک دوسرے کے دوست بنے ہوئے خاموش ہیں۔ اپنے آخری سفر پر۔ کیا تو ان سے بھی زیادہ کمزور ہے"؟

دریا میں لہروں پہ لہریں آئی ہوئی تھیں۔ کوئی کشتی نکل نہیں رہی تھی۔ "ماں! کشتی کدھر ہے"؟

"اُدھر ہے"۔ وہ چیخی اور اس نے ایک بہتے ہوئے تختے کو پکڑا۔ مجھے بھی چڑھایا اور خود بھی چڑھ گئی۔ میرے پیر ہل رہے تھے مگر اُس کے پیر مضبوط کھڑے تھے۔

سامنے ایک تن تنہا درخت ہل رہا تھا مگر اپنی جڑ پر مضبوط ۔ ماں نے کہا" دیکھ ۔ کبھی یہ درخت ایک بیج تھا اس کے ماں باپ بھائی بہن نہ تھے ۔ اللہ کے سوا کوئی مددگار نہ تھا ۔ مگر اس میں ہمت تھی ۔ ہواؤں اور بارشوں سے مقابلہ کرنے کی طاقت ۔ آج یہ کیسا جوان کھڑا ہو گیا ہے ۔ دنیا کی تمام للکاریں ایک طرف اور یہ اکیلا ایک طرف"

اچانک ایک اونچی لہر آئی اور ہمارا تختہ لڑکھڑایا ۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں ۔ پانی سر سے گزر رہا تھا ۔ جب کھولیں پانی سر سے گزر چکا تھا ۔ وہ آنکھیں کھوے کھڑی دعائیں کر رہی تھی ۔ اونچی لہر نے ہمارے تختے کو سامنے ساحل پر فوراً پہنچا دیا ۔

ہم دونوں بہت بھیگ گئے تھے اور سردی سے کانپ رہے تھے لیکن ہمارا مال فوراً دگنی قیمت پر بک گیا ۔ گوروں کی میم صاحبان ہماری وعدہ وفائی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں ۔ ان کے گھر آج ... آج مہمان آنے والے تھے ۔ اور یہ سوال تھا ان کی عزت کا ۔

ماں ! تو مر نے کو مر گئی لیکن ہمت اور وعدہ وفائی کا سبق سکھا کر ۔ تو نے سکھایا کہ میں مرغیوں اور بکریوں سے بڑھ کر دلیر اور جاں باز ہوں ۔ تو نے سکھایا کہ میں وہ بیج ہوں جو اللہ کے سہارے تمام آندھیوں اور طوفانوں کا خم ٹھونک کر مقابلہ کر سکتا ہے ۔ میں تنومند درخت بن سکتا ہوں ۔ تو نے سکھایا کہ حادثات کی لہر کس طرح ہمیں ساحل سے قریب پہنچا سکتی ہے اگر ہم سر پانی سے اوپر رکھیں ۔ ماں ! میں تیرا کتنا شکر گزار ہوں ۔

دانائی

شیخ سعدیؒ کو ملکوں کی سیر کا بہت شوق تھا ۔ ایک دفعہ شہر اصفہان میں گئے ۔ ایک خچر پر سوار تھے اور ایک مرغ اُن کے پاس تھا ۔ خرچ کے لئے فقط ایک پیسہ جیب میں تھا ، ایک لڑکا اُن کے برابر سے نکلا ، انہوں نے دل میں خیال کیا کہ اصفہان کے لوگ بہت عقلمند مشہور ہیں ۔ ان کا امتحان کرنا چاہیئے ۔ لڑکے کو آواز دے کر ٹھہرایا اور کہا" میاں لڑکے ! ہمارے پاس ایک پیسہ ہے اور تین جانیں ہیں کوئی ایسی تجویز بتاؤ کہ جس سے ایک پیسے میں گزارا ہو جائے"

لڑکے نے کہا" اے شخص ! بڑا تعجب ہے ۔ ایسا سن رسیدہ اور تجربہ کار اور اتنی بات کی تجھے عقل نہیں جا اور ایک پیسے کا سرداله آ ۔ دو ڈھائی سیر کا آئے گا ۔ آپ کھا اور ... چھلکے اپنے خچر کو کھلا ۔ بیچ مرغ کے آگے ڈال دے" شیخ سعدیؒ دل میں بہت قائل ہوئے اور کہا" سچ کہا ہے ، بزرگوں نے کہ پیر شو بیا موزیعنی بڈھا ہو اور سیکھے جا !"

مرسلہ :۔ محمد اکرم سیالوی ـــــــ گوٹھ چاہ سیالاں

محمد سلیم مُغل

بچّے کو اپنی سائیکل چوری ہونے کا بہت ملال تھا جب سائیکل نہیں ملی تو وہ ایک پولیس والے کے پاس پہنچا۔ پولیس مین نے بچّے کی بات سُننے کے بعد کہا "میں تمہاری کچھ مدد نہیں کر سکتا، اگر ہمّت ہے تو اپنا چور خود پکڑ لو۔"

پولیس مین سے ٹکا سا جواب سُن کر بچّہ غصّے میں پیر پٹختا ہوا گھر کی جانب چل دیا ... اُس کے ذہن میں بار بار ایک ہی خیال آ رہا تھا کہ جو شخص خود طاقت ور نہ ہو اس کی کوئی مدد نہیں کرتا، بس اپنی حفاظت کے لیے طاقت ور ہونا بہت ضروری ہے۔ اس خیال نے بچّے کی زندگی کو بدل کر رکھ دیا۔ انتقام اور غصّے میں بھرا ہوا یہ نیگرو بچہ تہیّہ کر چکا تھا کہ اب وہ باکسنگ سیکھے گا اور دشمن کو اپنے گھونسوں سے نیست و نابُود کر دے گا۔ امریکی ریاست کینٹکی (KENTUCKY) میں رہنے والے اس سیاہ فام بچّے نے جسے اُس کے دوست کیسس (CASSYUS) کہہ کر پکارا کرتے تھے، پوری لگن سے باکسنگ سیکھنا شروع کر دی۔ اُس وقت کون جانتا تھا کہ مُستقبل میں اس بچّے پر عظیم کامیابیوں کے دروازے کھلنے والے ہیں۔ وہ بڑا ہُوا تو عیسائیت سے تائب ہو گیا اور مسلمان ہو کر محمّد علی کہلایا۔ باکسنگ کی دنیا میں ہیوی ویٹ چیمپئن کی حیثیت سے اس کا نام طویل عرصے تک جگمگاتا رہا۔ محمد علی کی زندگی کا یہ دلچسپ واقعہ اپنے مخاطب کو سُنانے کے بعد میں نے پُوچھا۔

آپ بھی تو بین الاقوامی شُہرت رکھنے والے باکسر ہیں، کیا آپ کے ساتھ بھی بچپن میں کوئی ایسا واقعہ پیش آیا جس نے آپ کو باکسنگ کی طرف مائل کیا؟

"ہاں .... کیوں نہیں .... میرے مخاطب نے ماضی کے دریچوں میں جھانکتے ہوئے کہا .... جب میں چھوٹا تھا تو اسکول میں اکثر و بیشتر بچّے میری پٹائی کر دیا کرتے تھے .... میں لڑاکا بچّہ نہیں تھا اس لیے خاموشی سے پٹ جاتا اور رو کر

لیاری کے گلی کوچوں میں پل کر جوان ہونے والا

اولمپک کا پاکستانی ہیرو

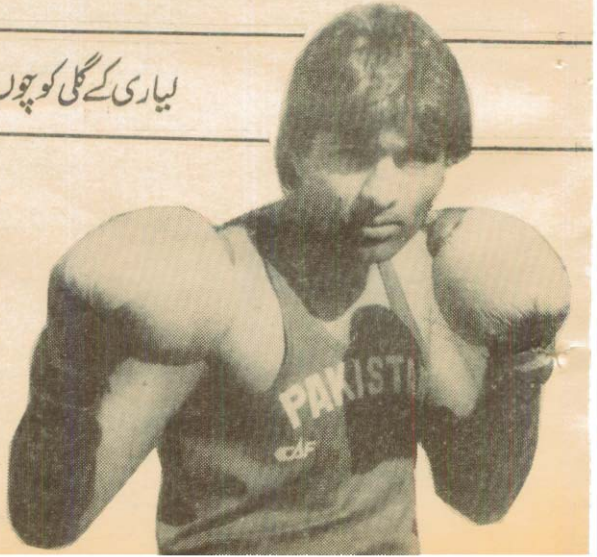

چُپ ہو جاتا۔ میرے دوست کریم بخش اور اسلم پرویز مجھ سے کہا کرتے تھے کہ اگر تو باکسنگ نہیں سیکھے گا تو اسی طرح پٹتا رہے گا.... باکسنگ سیکھ لے پھر کوئی بچّہ تجھے تنگ نہیں کرے گا۔ ایک روز بچّوں نے میرا بستہ چھین لیا اور واپس نہیں کیا تو میں نے ارادہ کر لیا کہ اب باکسنگ سیکھ کر سارے بدلے چکاؤں گا....؛ اتنا کہہ کر عظیم پاکستانی باکسر حسین شاہ تھوڑی دیر کے لیے چُپ ہو گیا۔ میں اس وقت اُس کے گھر پر تھا۔ سول اولمپک میں حسین شاہ نے جب کانسی کا تمغہ حاصل کیا تھا تو میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ میں آنکھ مچولی کے ساتھیوں کو اس باکسر سے ضرور ملواؤں گا۔

لیاری بستی کے محلّہ نیو کمہار واڑا میں حسین شاہ سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے اس سے کہا

مبارک ہو حسین شاہ آپ نے سول اولمپک میں کانسی کا تمغہ حاصل کر کے پاکستان کو اُن ۱۸ ممالک میں شامل ہونے سے بچا لیا جو کوئی بھی تمغہ حاصل نہ کر سکے...

جی.... خیر مُبارک.... بہت شکریہ.... نوجوان باکسر نے نظریں جُھکا کر شرماتے ہوئے جواب دیا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ کیونکہ میں تو سمجھ رہا تھا کہ حسین شاہ ایک انتہائی دہشتناک باکسر ہوگا جبھی تو اُس نے اتنے ڈھیر سارے باکسروں کو پے درپے شکست دی. مگر حسین شاہ تو اس کے بالکل برعکس نِکلا.... دھیما نرم لہجہ.... مزاج میں تحمّل.... چہرے پر معصومیّت.... بہت ہی سادہ. بڑا ہی پُروقار بقول

نرم دمِ گفتگو ، گرم دمِ جستجو...

"یار مُعاف کرنا..." حسین شاہ نے کہا.... "میرے گھر میں تو اتنی جگہ نہیں ہے کہ کسی مہمان کو بٹھا سکوں ، آؤ سامنے اپنے دوست (موٹر سائیکل مکینک) کی دکان پر بیٹھتے ہیں"

ہم گھر سے دکان پر آگئے۔ حسین شاہ نے ایک بچّے سے قریبی ہوٹل سے چائے منگوائی۔ میرے ساتھ میرا دوست سُہیل جلبانی تھا اور حسین شاہ کے ساتھ بھی اُس کا کوئی دوست تھا۔

آپ اپنے دوست کا تعارف کروانا پسند کریں گے ؟ میں نے کہا...

ہاں ! یہ کریم بخش ہے میرے جگر کا ٹکڑا میرا دوست، ہماری دوستی کو ۱۸ برس بیت گئے ہیں۔ ان برسوں میں ہماری دوستی پہلے سے زیادہ مضبوط ہوئی ہے، کریم بخش کو دیکھتے ہی میں اپنے سارے غم بھُول جاتا ہوں...آپ نے اسے کراچی ٹی وی کے جشنِ تمثیل والے ڈرامے میں بھی دیکھا ہوگا... یہ باکسر بھی ہے اور شاعر بھی...

ارے... یہ وہی کریم بخش تو ہے جس نے بچپن میں باکسنگ سیکھنے کا مشورہ دیا تھا تاکہ کوئی بچّہ میری پٹائی نہ کر سکے۔

ہاں... مجھے یاد آیا... تو پھر جب آپ نے باکسنگ سیکھنا شروع کر دی تو کیا واقعی بچّے آپ سے ڈرنے لگے اور وہ بستہ جو بچّوں نے چھین لیا تھا وہ مِل گیا؟

نہیں وہ بستہ نہیں ملا... میں نے باکسنگ تو سیکھ لی مگر بستہ پھر بھی حاصل نہ کر سکا... بستہ کیا چھینا میری تعلیم بھی چھن گئی... میں تین جماعتوں سے زیادہ نہ پڑھ سکا..... جس کا مجھے آج تک ملال ہے..... دراصل نہ پڑھنے کی تو کچھ اور بھی وجوہات ہیں۔ میرے والد صاحب کراچی پورٹ ٹرسٹ کے مزدور تھے۔ اُنہیں ایک بڑے کنبے کا پیٹ پالنا تھا۔ اس لیے مجھے بھی بچپن ہی میں مزدوری کرنا پڑی۔ پڑھتا کیسے؟ اسی لیے اب میں سب سے کہتا ہوں کہ کھیل کے ساتھ تعلیم اور تعلیم کے ساتھ کھیل بھی ضروری ہے..... اب یہی دیکھیے نا! انگریزی نہ جاننے کی وجہ سے بیرونِ ملک سفر میں مجھے بہت پریشانیاں اُٹھانی پڑتی ہیں۔ ویسے بھی تعلیم سے رہنے سہنے، اُٹھنے بیٹھنے کا سلیقہ آتا ہے اور بہتر ملازمت کے مواقع بھی مل جاتے ہیں۔

تو کیا اس وقت آپ اپنی ملازمت سے مطمئن نہیں ہیں؟ میں نے پوچھا۔

گزشتہ چھ برس سے میں کے ای ایس سی میں ملازم ہوں پہلے میں گریڈ ۴ کا جونیئر افسر تھا دو ہزار روپے تنخواہ ملتی تھی مگر اولمپک سے تمغہ جیتنے کے بعد مجھے گریڈ سات میں ترقی دے کر چیف سیکیورٹی انسپکٹر بنا دیا گیا ہے۔ اُمید ہے اب مناسب تنخواہ ملے گی... طلائی تمغہ جیتنے پر محکمے نے مجھے ۲۵ ہزار روپے کا انعام بھی دیا ہے۔

آپ کو کسی اور ادارے یا حکومت کی جانب سے بھی انعام ملا ہے؟ میں نے جاننا چاہا۔

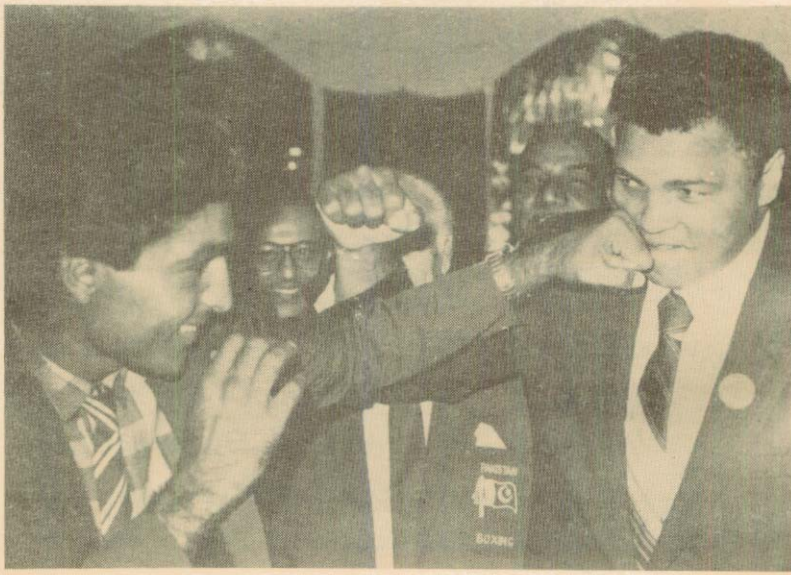

عالمی شہرت یافتہ باکسر محمد علی کے ہمراہ حسین شاہ کی ایک یادگار تصویر

ہاں کلاکوٹ فٹ بال کلب نے پانچ ہزار روپے دیے ہیں جبکہ اسکواش کے مشہور کھلاڑی قمرالزماں نے مبارک باد کے خط کے ساتھ پانچ ہزار روپے کا چیک بھجوایا ہے ....اس چیک کی مجھے بے حد خوشی ہے ....واقعی قمرالزماں عظیم کھلاڑی ہے ۔ میرے دل میں اُس سے ملنے کی خواہش بڑھ گئی ہے ۔

اس کے برعکس حکومت نے وعدہ کیا تھا کہ گولڈ میڈل جیتنے پر ایک لاکھ روپے، سلور میڈل پر ۸۰ ہزار روپے اور کانسی کے تمغے پر ساٹھ ہزار کا انعام دیا جائے گا مگر ملا کچھ بھی نہیں.... ایشین گیمز کے وقت بھی ایسی ہی وعدہ خلافی کی گئی حالانکہ میں نے سلور میڈل جیتا تھا ۔ انعام کو تو چھوڑیے .... سول سے پاکستان واپسی پر کوئی سرکاری افسر مجھے لینے تک نہیں آیا سوائے کے ای ایس سی کے چند افسران اور لیاری کے چند دوستوں کے ۔ حالانکہ میری جیت میرے وطن کی جیت تھی، پاکستان کی جیت تھی ۔ اور پھر ہم تو ویسے بھی ایمیچر ہیں، ایمیچر تو صرف ملک کے لیے کھیلتا ہے ۔

یہ ایمیچر کیا ہوتا ہے ۔۔؟ میں نے پوچھا ۔

دراصل دو طرح کے باکسر ہوتے ہیں ایک پیشہ ور باکسر جو پیشہ ور کہلاتے ہیں اور بڑی بڑی رقوم کے لیے مقابلہ کرتے ہیں ۔ دوسرے ایمیچر جو صرف ملک کی خاطر لڑتے ہیں ۔ میں بھی ایمیچر ہوں ۔

حسین شاہ، جب آپ ملک کی خاطر مقابلوں میں شریک ہوتے ہیں تو پھر پیسوں کا اتنا شکوہ کیوں؟

نہیں ! آپ نے میری بات شاید غور سے نہیں سُنی ۔ میں نے تو صرف یہ کہا ہے کہ سرکاری سطح پر میری حوصلہ افزائی نہیں ہوئی ... میں حکومت سے اور کچھ نہیں چاہتا .... بس یہ چاہتا ہوں کہ میرے بنیادی مسائل حل ہو جائیں تاکہ میں گھر کے مسائل کی طرف سے بے نیاز ہو کر پوری توجہ باکسنگ پر دے سکوں ۔ اب میرا مشن اگلے اولمپک میں گولڈ میڈل حاصل کرنا ہے اگر میں گھر کے مسائل میں اُلجھ کر رہ گیا تو گولڈ میڈل کیسے حاصل کر سکوں گا ؟ میں باکسر کے ساتھ ساتھ انسان بھی ہوں اور ہر انسان کی طرح میں بھی چاہتا ہوں کہ میرے بچے پڑھ لکھ جائیں اور میرے پاس ایک چھوٹا سا گھر ہو ۔ خواہ کرائے ہی کا ہے ۔

تو کیا آپ کے پاس اِس وقت گھر نہیں ہے ؟

کیا آپ دیکھنا چاہیں گے ؟ حسین شاہ نے اُلٹا سوال کر دیا ۔ "آئیے میرے ساتھ "

حسین شاہ ہمیں اپنے ساتھ لے کر چل پڑا ۔ ایک سرنگ نما گلی کے آخر میں ایک دروازے سے اندر داخل ہوئے تو حیرت سے ہمارا منہ کھُلا رہ گیا ۔ یہ ایک قومی ہیرو کا گھر تھا ۔ گھر کیا ایک کمرہ تھا جو ۱۰ × ۱۰ فٹ سے زیادہ کا نہ ہو گا.... کمرے میں ۴ فٹ اونچا ایک تخت، تخت کے نیچے گھر بھر کا سامان، تخت کے ساتھ چھت

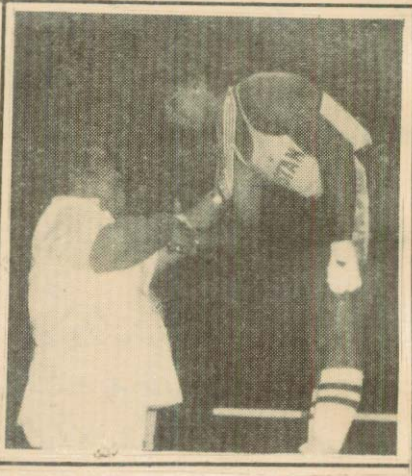

تک لگے ہوئے بستر، دیواروں پر ڈھیر سارے تمغے حسین شاہ کے بین الاقوامی مقابلوں کی تصویریں اور تصویروں کا مُنہ چڑاتی ہوئی دیواریں۔

اس گھر میں آپ سب لوگ کس طرح رہ لیتے ہیں؟

اس کا جواب تو آپ دیجیے .... حسین شاہ نے رُکے بغیر کہا۔ ہم چار بھائی، تین بہنیں، والد صاحب اور والدہ۔ اس کا کرایہ ایک سو تیس روپے ہے۔ اور یہ جو تمغے آپ دیکھ رہے ہیں یہ میں نے بمبئی، کلکتہ، نیپال، ڈھاکہ، کوریا اور جکارتہ کے بین الاقوامی مقابلوں میں جیتے ہیں۔

حسین شاہ آپ کے تو مزے آگئے ... ۱۲ گولڈ میڈل! کس قدر سونا موجود ہے آپ کے پاس ... میں نے کہا۔

جی نہیں .... یہ سونے کے نہیں ہیں .... ان پر سونے کا پانی چڑھا ہوا ہے اگر سچ مچ سونے کے ہوتے تو پھر رونا کیا تھا .... میں انھیں بیچ کر اپنے مسائل حل نہ کر لیتا۔

ہم دونوں گھر سے باہر آئے اور ایک خستہ حال تھڑے پر بیٹھ کر گپ شپ کرنے لگے۔ حسین شاہ اپنی ابتدائی زندگی کی باتیں بتا رہا تھا۔ میرا تعلق سندھ کے سید کچھی خاندان سے ہے۔ ہماری زبان بھی سندھی سے بڑی حد تک ملتی جلتی ہے، میں کراچی ہی میں پیدا ہُوا۔ لیاری کے انہی گلی کوچوں میں کھیل کُود کر بڑا ہوا۔ ابھی ۶ سال کا تھا کہ والدہ کا انتقال ہوگیا۔

یہ کہتے ہوئے حسین شاہ کچھ کھو سا گیا، پھر اُس کی آنکھیں نم ہوگئیں .... اور وہ بچّوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا .... مجھے ایسا لگا جیسے کسی ننھے بچّے کے ہاتھ سے ماں کی اُنگلی چھُوٹ گئی ہو .... حسین شاہ نے اپنے آنسو پونچھے اور پھر بولنا شروع کیا ....

میرے محلّے والے بتاتے ہیں، میں اپنی ماں کا بہت لاڈلا تھا۔ وہ مجھے بہت پیار کرتی تھی .... وہ زندہ ہوتی تو آج کتنی خوش ہوتی، میری خوشیاں بھی اپنی ماں کے بغیر اَدھوری ہیں۔ والدہ کے انتقال کے بعد والد صاحب نے دوسری شادی کر لی۔

میں نے یونہی گفتگو کا موضوع بدلنے کے لیے کہا۔

حُسین شاہ آپ باکسنگ کے چکّر میں کیوں پڑ گئے ... آپ جیسے حساس آدمی کے لیے یہ وحشیانہ کھیل کچھ مناسب نہیں ہے۔

یہ آپ کی غلط فہمی ہے، باکسنگ وحشیانہ کھیل نہیں ہے۔ اِسے محمد علی نے تو بڑا ٹیکنی کل بنا دیا ہے۔ اس میں تمام نازک جگہوں کی حفاظت کی جاتی ہے، کسی کو ذرا سی چوٹ لگ جائے تو ریفری فوراً کھیل رُکوا دیتا ہے۔

اسی طرح ناک آؤٹ کرنے والا کھلاڑی کبھی اچھا نہیں سمجھا جاتا بلکہ پوائنٹس پر جیتنے والا کھلاڑی بہتر تصور کیا جاتا ہے۔ اگر یہ وحشیانہ کھیل ہوتا تو میں کیسے کھیلتا.... آپ کو تو پتہ ہے میں کچھی برادری سے تعلق رکھتا ہوں جس کا کوئی فرد کسی وحشیانہ کھیل کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جب میں باکسنگ سیکھنے کے لیے گیا تو اُستاد نے قسم لی کہ کسی سے لڑائی نہیں کروں گا۔ اور میں نے کبھی لڑائی نہیں کی۔

حُسین شاہ اس کھیل کا کوئی فائدہ بھی ہے؟

باکسنگ تحمل سکھاتی ہے۔ بہادر بناتی ہے۔ باکسر سگریٹ اور نشے سے پرہیز کرتا ہے، صحت اچھی رہتی ہے۔ یہ فائدے کم ہیں۔

مگر اچھی صحت کے لیے اچھی خوراک بھی تو ضروری ہے.... آپ کیا کھاتے ہیں؟

ہم لوگ بھلا اور کیا کھائیں گے، یہ سینیں، پکوڑے، بسکٹ اور ہوٹل کی چائے وغیرہ پی کر پیٹ بھر لیتے ہیں۔ خوراک بچپن سے اچھی ملنی چاہیئے تھی.... خوراک اچھی ملتی تو گولڈ میڈل لے کر نہ آجاتا.... مجھے یاد ہے اپنے بچپن میں ہم اکثر بغیر کھانا کھائے سو جاتے تھے۔ اتنے پیسے ہی نہ تھے کہ اچھی خوراک کھا سکیں۔

مجھے ایسا لگتا ہے جیسے آپ محمد علی سے متاثر ہوں؟

یقیناً محمد علی میرا آئیڈیل ہے۔ میں اسلام آباد کے ایوانِ صدارت میں ان سے مل بھی چکا ہوں، محمد علی نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر اچھے باکسر بننا چاہتے ہو تو اپنے فٹ ورک ٹھیک کرو.... میں محمد علی کے مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اولمپک کے سیمی فائنل میں اپنی شکست کے اسباب حسین شاہ نے یوں بیان کیے میرا پہلا مقابلہ میکسیکو سے تھا، یہ سخت ترین باکسر تھا، اگر میں اس سے ہار جاتا تو یہی باکسر گولڈ میڈل بھی جیت جاتا۔ اس کے بعد اللہ کے فضل و کرم سے میں زائر اور ہنگری کے باکسروں کو بھی شکست دیتا چلا گیا، لیکن تین مسلسل مقابلوں سے میں ٹوٹ چکا تھا.... میرا پورا جسم پوری طرح دُکھ رہا تھا، پھر ایک غلطی یہ بھی ہوئی کہ میں نے سیمی فائنل کو آسان

کل کا بچہ آج کا ہیرو حسین شاہ

سمجھا میرا خیال تھا آرام سے کھیلوں اور اپنی پوری قوت کو فائنل کے لیے بچا کر رکھوں بس یہی غلطی ہو گئی مجھے افسوس ہے میں گولڈ میڈل نہیں لا سکا ۔ مگر افسوس گولڈ میڈل کا نہیں ہے افسوس تو اس بات کا ہے کہ پاکستان کا نام سب سے اوپر کیوں نہیں آیا .... کاش پاکستان کا پرچم سب سے بلند ہوتا، قومی ترانہ سنایا جاتا تو کس قدر خوشی ہوتی ۔

آئندہ کے کیا عزائم ہیں ؟ میں نے پوچھا۔

میں عنقریب ماسکو جاؤں گا جہاں دنیا کے نمبر ا نمبر ۲ اور نمبر ۳ چیمپئن شریک ہوں گے، خدا کرے میں یہاں کوئی بڑا اعزاز لے سکوں ۔

کوئی بات براہِ راست ہمارے ساتھیوں سے بھی کریں ۔

ضرور .... ضرور .... میں اپنے طالب علم دوستوں سے یہی کہوں گا کہ وہ جو کام بھی کرنا چاہیں اُسے زندگی کا مقصد بنا لیں اور پھر خوب محنت کریں .... یقیناً وہ کامیاب ہوں گے اور تعلیم کو ہر مشغلے سے زیادہ اہمیت دیں۔

اجازت لینے سے پہلے میں نے حسین شاہ کے دوست کریم بخش سے پوچھا' آپ نے حسین شاہ کو کیسا پایا؟

کریم بخش نے ایک نظر حسین شاہ پر ڈالی اور پھر کہا۔

اسے شروع ہی سے باکسنگ کا جنون تھا۔ ہر وقت باکسنگ کھیلنا، باکسنگ کی باتیں کرنا بلکہ باکسنگ کے کپڑوں اور جوتوں ہی میں رات کو سو بھی جایا کرتا تھا۔ مجھ سے اکثر کہتا تھا کریم بخش! ایک دن آئے گا جب میں پاکستان کے لیے گولڈ میڈل لے کر آؤں گا، میں اس کی باتوں پر خوب ہنسا کرتا تھا کیوں کہ اس کی باتیں اس وقت انہونی معلوم ہوتی تھیں۔ مگر آج میں سوچتا ہوں کہ عزم راسخ ہو اور لگن سچی ہو تو دنیا کا کوئی کام ناممکن نہیں ہے۔

کراچی، شہر قائد آپ کو خوش آمدید کہتا ہے
واپسی پر اپنے عزیزوں اور دوستوں کیلئے کراچی کا مخصوص تحفہ
احمد کے حلوہ جات
ساتھ لے کر آنا ہرگز نہ بھولیئے
فریش ویل
حبشی حلوہ
حلوہ جوزی
فریش ویل
سوہن ڈیلائیٹ
فریش ویل
سوہن حلوہ
Freshwel
MANGONICA
MASS

سورج مکھی حیوانات

مہوش شکیل

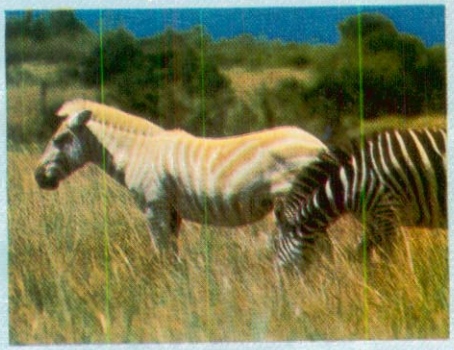

"ابّو .... ابّو سامنے والے گھر میں جو نئے کرائے دار آئے ہیں اُن کے ہاں ایک بوڑھا بچّہ ہے اس کے ہاتھ، پیر، بال سب سفید ہیں۔" کامی نے باہر سے دوڑ کر آتے ہوئے حیرت سے آنکھیں پھیلا کر ابّو کو اطّلاع دی۔ ابّو نے جواب دینے کے لیے اخبار سے نظریں اُٹھائی ہی تھیں کہ اُن کے پاس

بیٹھی کامی کی امّی نے کامی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں بیٹا وہ بوڑھا نہیں بلکہ سورج مُکھی بچّہ ہے۔" "یہ کیا ہوتا ہے امّی؟" کامی نے سوال کیا۔

"بھئی جو بچے چاند یا سورج گرہن کے زیرِ اثر پیدا ہوتے ہیں اُنہیں سورج مُکھی کہتے ہیں۔" امّی نے وضاحت کی۔

"نہیں بیٹا تمہاری امّی کا خیال غلط ہے۔ انسانوں کی طرح مختلف حیوانات کے ہاں بھی ایسے ہی سورج مُکھی بچّے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن سورج یا چاند گرہن کے زیرِ اثر نہیں بلکہ کسی اور وجہ سے۔"

"کس وجہ سے ابّو؟" کامی میاں کمبل ہونے لگے تھے۔ "بھئی یہ جانداروں کی جینئز میں تبدیلی کی وجہ سے ہوتا ہے۔"

"یہ جینئز کیا ہوتی ہیں؟" کامی نے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے پوچھا۔

".... مختصراً یوں سمجھو کہ جینئز جانداروں میں اُن کے نر یا مادہ کا تعین کرنے والی قوت کو کہتے ہیں۔ دنیا میں پائے جانے والے تمام جانداروں کے CELLS یا خلیے ہزاروں جینئز سے مل کر بنتے ہیں۔ ان جینئز کی ایک مخصوص ترتیب ہی دراصل ہر جاندار کی ایک مخصوص جنس اور اُس کے ایک مخصوص انداز میں پلنے بڑھنے کی ذمّے دار ہوتی ہے۔

جینئز جسم میں جوڑوں کی شکل میں عمل کرتی ہیں۔ ہر جاندار کے اندر پائی جانے والی ساری خصوصیات جینئز کے اثرات کی پابند ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک پینگوئین کے جسم کے کچھ حصّوں پر سفید اور کچھ پر سیاہ بال نکلتے ہیں۔ بھلا کیوں؟ وہ اس لیے کہ پینگوئین کے جینئز اُس کے جسم کو حکم دیتے ہیں کہ اُسے کچھ مقامات پر سیاہ اور کچھ مقامات پر سفید ہونا چاہیے۔

انسانوں کی طرح حیوانات کو بھی یہ جینئز اپنے ماں باپ سے ورثے میں ملتے ہیں۔ ہر حیوان اپنے والدین سے جینئز کا ایک ایک جوڑہ ورثے میں پاتا ہے۔ بچوں کو ورثے میں ملنے والے یہ جینئز ماں باپ کے جینئز سے گہری مشابہت رکھتے ہیں تاہم بعض اوقات بچّوں کو ورثے میں ملنے والے جینئز والدین کے جینئز کی طرح نہیں ہوتے۔ اس کے باعث جینئز کی مخصوص ترتیب غلط ہو جاتی ہے نتیجتاً جینئز (MUTATION) یا تغیر کا شکار ہو جاتے ہیں اور بچّے اپنے والدین سے مختلف رنگت لے کر پیدا ہوتے ہیں۔" ابّو یوں بولتے چلے گئے جیسے وہ کلاس کو لیکچر دے رہے ہوں۔ "ابّو میرے دوست بتا رہے تھے کہ سانولے والوں کا بچہ دھوپ میں بھی کم نکلتا ہے، کیوں؟"

"بیٹا ایسے انسان دھوپ سے شدید تکلیف محسوس کرتے ہیں۔ میں نے پڑھا ہے کہ سورج مُکھی حیوانات جنگل میں بڑی مشکل زندگی گزارتے ہیں۔ مثلاً ایک پیلا گرگٹ ہرے درخت پر بیٹھا ہوا دشمن کو دُور ہی سے نظر آجاتا ہے۔ میں نے یہ بھی پڑھا ہے کہ سورج مُکھی مور کی نظر انتہائی کمزور ہوتی ہے چنانچہ وہ اپنے دشمن کو دُور سے نہیں دیکھ پاتا۔ یہی وجہ ہے کہ سورج مکھی جانور چڑیا گھر میں محفوظ کر لیے جاتے ہیں۔ جہاں نہ صرف یہ کہ اُن کی نسل کی افزائش ہوتی رہتی ہے بلکہ وہ مختلف رنگت کے حامل ہونے کے باعث شائقین کی توجہ کا مرکز بھی بنے رہتے ہیں۔"

"اللہ کی قدرت ہے بیٹا!" کامی کی امّی جو کامی کے ابّو کی تقریر بڑے غور سے سُن رہی تھیں۔ ہاتھ کو ڈگڈگی کی طرح آہستہ سے ہلاتے ہوئے بولیں۔ سب لوگ چُپ ہو گئے۔ کامی میاں آسمان کو دیکھنے لگے۔

کیا مرغی کیا نخرے!

امریکہ کا ایک مرغی فارم۔ روئی کے گالوں کی طرح سفید رنگت والی میڈم ہینی پینی کی آنکھ کھلی تو انہوں نے دیکھا کہ ڈربے سے اُن کی سہیلی مرغیاں غائب ہیں۔ ڈربے کو خالی دیکھ کر میڈم ہینی پینی نے خود سے کہا "لگتا ہے صبح ہوگئی ہے" "مگر آج میری آنکھ کیوں نہیں کھلی، پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا...." ہینی پینی کٹکٹائی اور پھر ڈربے سے باہر نکل گئی۔

"ہیں.... یہ کیا.... مجھے سب چیزیں لال لال کیوں نظر آرہی ہیں؟ درخت، لان کی گھاس، آسمان .... سب کچھ لال.... یا خدایا یہ کیا ماجرا ہے؟ کیا میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں...." ہینی پینی نے اپنے پاؤں پر زور سے ٹھونگ ماری،... تکلیف نے اُنہیں بتادیا کہ وہ خواب نہیں دیکھ رہی ہیں،

ہینی پینی دوڑتی ہوئی اپنی سہیلی مرغیوں کے پاس گئیں اور باری باری سب سے پوچھا کہ اُنھیں سب چیزیں لال کیوں نظر آرہی ہیں، کچھ مرغیاں تو اُن کی بات سُنتے ہی کٹ کٹ کٹاک.... کٹ کٹ کٹاک.... قہقہے لگانے لگیں جبکہ کچھ نے ہینی پینی سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے اس بات کو سمجھنے سے معذوری ظاہر کی کہ اُنہیں سب چیزیں لال کیوں نظر آرہی ہیں۔ اپنے اپنے ظرف کی بات ہے۔ ہینی پینی سب سے پوچھ پوچھ کر تھک گئیں مگر اُنھیں کچھ پتا نہ چلا ان کی اپنی عقل نے بھی اُن کا ساتھ نہ دیا تو وہ ڈربے میں گھس کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

اب ہینی پینی کو کون بتاتا کہ مُرغی فارم کے مالک نے اُن کی آنکھوں میں لال رنگ کے کونٹیکٹ لینسز فٹ کر دیے ہیں۔ یہ وہی کونٹیکٹ لینسز ہیں جو کمزور نظر کے لوگ چشمے کے بجائے لگاتے ہیں، یہ لینسز تھا کرائیٹ نام کی پلاسٹک سے بنائے جاتے ہیں۔ تو کیا ہینی پینی کی نظر کمزور ہوگئی تھی؟؟ نہیں بھئی.... اصل میں بات یہ ہے کہ مرغیوں پر برسوں کی تحقیق کے بعد پتا چلا ہے کہ اگر اُن کی آنکھوں میں سُرخ رنگ کے لینسز فٹ کر دیے جائیں تو اس سے مرغیوں کے رویّے پر حیرت انگیز اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ مثلاً لینسز لگ جانے کے بعد مرغیاں اپنے انڈے کھانے کی عادت سے باز آجاتی ہیں۔ نیز مرغیاں پہلے سے زیادہ فرمانبردار ہوجاتی ہیں۔ اس کے علاوہ کم غذا کھا کر زیادہ انڈے دینے لگتی ہیں اور یوں مرغیوں کا کاروبار کرنے والے زیادہ سے زیادہ منافع کماتے ہیں۔ کیا کہا.... آپ کو ان باتوں کا یقین نہیں۔ افسوس.... مگر ٹھیک ہے آپ اس پتے پر خط لکھ کر جھوٹ سچ معلوم کر سکتے ہیں۔

Mail to: Animalens, Inc.
One Hollis Street
Wellesley, MA 02181
U.S.A.

سائنس فکشن

جادو کی ایک چھڑی

شین فاروقی

اُس دنیا کی کہانی کیسے لکھی جاتی ہے جسے لکھنے والے نے دیکھا ہی نہیں

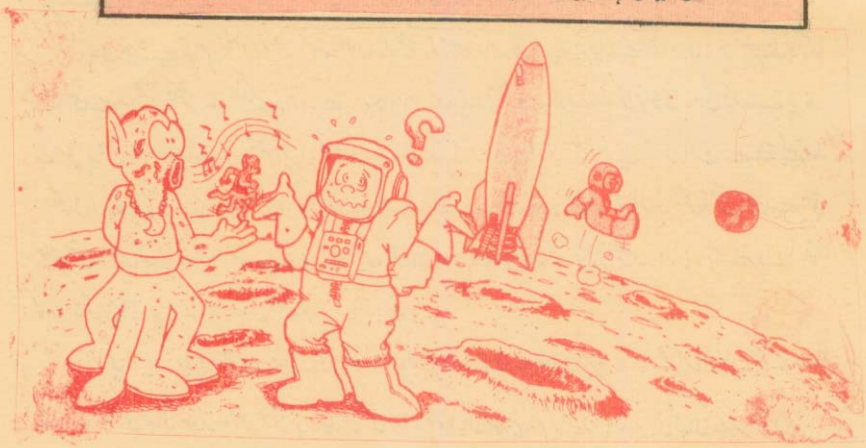

چار آنکھوں اور پانچ ہاتھوں والے عجیب و غریب انسان، چاند یا دور دراز کے کسی سیارے کا سفر، آواز سے کئی گُنا زیادہ رفتار سے سفر کرنے والا راکٹ۔

ان سب عناصر سے آپ کے ذہن میں کس چیز کا تصوّر آتا ہے؟

سائنسی کہانی یا سائنس فکشن کا۔

آپ بالکل درست سمجھے یہ سب عناصر بلاشبہ کسی سائنسی کہانی یا ناول کا ہی حصّہ ہو سکتے ہیں۔ اس کے برعکس دوسری طرح کا فکشن یا ادب وہ ہوتا ہے جو زمین اور اُس پر رہنے والے انسانوں کی زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ عام رسائل و جرائد میں شائع ہونے والی کہانیاں، افسانے اور ناول اِسی ادب کے ذیل میں آتے ہیں۔

سائنس کا عمل دخل ہماری زندگی میں جیسے جیسے بڑھتا جا رہا ہے ویسے ویسے سائنس سے متعلق بہت سی دیگر چیزوں کے ساتھ ساتھ سائنسی ادب یا سائنس فکشن بھی دنیا بھر میں مقبولیت حاصل کرتا جا رہا ہے۔ گو اب سے ہزاروں سال پہلے بھی سائنسی ادب لکھا اور پڑھا جاتا تھا لیکن اس کی نوعیت اور اس کی مقبولیت کا یہ عالم نہ تھا جو آج ہے۔ آج دنیا

کے سائنسی طور پر ترقی یافتہ ممالک امریکہ، برطانیہ اور جاپان وغیرہ میں ہر روز سینکڑوں سائنسی کہانیاں اور ناول شائع ہوتے ہیں۔

سائنسی ادب کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی خود سائنس کی، سائنس فکشن کا پہلا باقاعدہ لکھنے والا ایک یونانی فلسفی لیوسی ان سموساٹا تھا۔ مستند تاریخی شواہد کے مطابق سموساٹا کا زمانہ ۱۵۰ء عیسوی کے آس پاس کا ہے۔ اپنی کتاب "حقیقی تاریخ" میں سموساٹا نے بحر اوقیانوس میں سفر کرنے والے ایک بحری جہاز کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ بحری جہاز سمندر میں یکایک پیدا ہو جانے والے عظیم الشان بگولے کی زد میں آجاتا ہے یہ بگولا جہاز کو خود میں سمو کر چاند پر لے جاتا ہے۔

چاند ہمیشہ سے تمام سائنس فکشن لکھنے والوں کے تخیل کو مسحور کرتا رہا ہے چنانچہ چاند کے سفر اور چاند پر پہنچنے کی خواہش ابتدا ہی سے سائنس فکشن سے جھلکتی رہی ہے۔ ۱۶۵۷ء میں ایک فرانسیسی ادیب سائرانو ڈی۔ برگ ایک نے چاند کے سفر پر مبنی پہلی باقاعدہ سائنسی کہانی تحریر کی۔ اس کہانی کے کردار چاند پر جانے کے لیے جدید راکٹ سے ملتے جلتے جہاز استعمال کرتے ہیں، البتہ ان کے یہ راکٹ نما جہاز جدید دور کے راکٹ سے بہت چھوٹے تھے۔ اور اُن کی شکل آتش بازی سے ملتی جلتی تھی۔ اس کہانی کے کردار جب چاند پر پہنچتے ہیں۔ تو انہیں وہاں چار پیروں اور موسیقی جیسی آوازیں نکالنے والے انسانوں کا سامنا کرنا پڑا۔ چاند کے یہ انسان مکمل طور پر عریاں تھے۔

امریکی ادیب ایڈگر ایلن پو بنیادی طور پر خوفناک کہانیوں کے خالق کے طور پر پہچانے جاتے ہیں۔ لیکن پو نے ۱۸۳۵ء میں ایک سائنسی کہانی لکھ کر سائنس فکشن کی دُنیا میں بھی اپنا نام نمایاں طور پر رقم کرالیا۔ پو نے اپنی کہانی کے کرداروں کو ایک ایسے غبارے کی مدد سے چاند پر جاتا ہوا دکھایا ہے جس میں ایک مشین فٹ ہے۔

سائنس فکشن کی تاریخ کا ایک نمایاں نام ایڈگر رائس برو ہے۔ یہ وہی رائس برو ہے جس نے مشہورِ زمانہ کردار ٹارزن تخلیق کیا۔ برو نے اپنے سائنس فکشن میں تخیل کی ایک نئی دنیا پیدا کی ہے۔ اس نے اپنی کہانی کے ایک کردار کو ٹیلی پیتھی کی مدد سے مریخ پر جاتا ہُوا دکھایا ہے۔ برو کے اس کردار کو مریخ پر جس مخلوق سے واسطہ پڑتا ہے اس کا رنگ ہرا اور لال ہے۔ اس مخلوق کے چھ ہاتھ پیر ہیں اور اس مخلوق کے بچے انڈوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ برو تک جتنا سائنس فکشن لکھا گیا اُس کا شمار قدرے پرانے زمانے کے فکشن میں کیا جاتا ہے۔

جدید سائنس فکشن اور پرانے سائنس فکشن کے درمیان ایک بڑا بنیادی فرق ہے اور وہ یہ کہ پہلے سائنس فکشن میں صرف تصوراتی ماحول اور کرداروں کے ذریعہ کہانی بُنی جاتی تھی۔ جبکہ آج کے دور میں سائنسی ایجادات و اختراعات اور ان ایجادات و اختراعات کے حوالے سے رونما ہونے والے حقیقی واقعات کو بنیاد بنایا جاتا ہے۔

تخلیقی اور تصوراتی دنیا آج کے سائنس فکشن میں بھی پائی جاتی ہے مگر یہ دنیا تخیل کے ساتھ حقیقت کا عنصر بھی

اپنے اندر رکھتی ہے جولیئس ورن اور ایچ جی ویلز جدید سائنس فکشن کے باوا آدم تصوّر کیے جاتے ہیں۔

ایچ جی ویلز نے اپنی مشہورِ زمانہ کتاب "وقت کی مشین" میں انسانوں کو وقت کے ذریعہ سفر کرتے دکھایا ہے۔ جبکہ اپنی دوسری کتاب "دو دنیاؤں کی جنگ" میں ویلز نے زمین پر مریخی انسانوں کو حملہ آور ہوتا دکھایا ہے۔ اس ناول میں جب مریخ کے لوگ زمینی انسانوں پر فتح حاصل کرنے کے قریب ہوتے ہیں تو انہیں زمین پر پائے جانے والے بیکٹیریا کے باعث نزلہ ہو جاتا ہے اور مریخ کے تمام حملہ آور اس بیماری کا شکار ہو کر ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اُن کی ہلاکت کی وجہ ہے کہ اُن کے جسموں میں زمین پر پائے جانے والے معمولی بیکٹریا کے خلاف مدافعتی صلاحیت موجود نہیں۔ ویلز نے یہ ناول بالترتیب ۱۸۹۵ء اور ۱۸۹۸ء میں تحریر کیے۔ ویلز نے اپنے سائنس فکشن میں مستقبل کے متعلق کئی پیش گوئیاں کی ہیں۔

ویلز کے سائنسی تصوّرات کی قوت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُس نے اپنے ناولوں میں جن تصوّرات کو کہانی کی شکل میں پیش کیا ہے ان کو بنیاد بنا کر آج بھی بہت سے ادیب سائنس فکشن تحریر کر رہے ہیں۔

ویلز کی ایک اور قابلِ ذکر کتاب "چاند پر پہلا آدمی" ہے۔ یہ کتاب ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں ویلز نے یہ خیال پیش کیا ہے کہ اگر چاند، مریخ یا کسی دوسرے سیارے پر کوئی مخلوق موجود ہے تو اُس کے آباؤ اجداد اور زمین کے باسیوں کے آباؤ اجداد یقیناً ایک رہے ہوں گے۔ ویلز کا یہ خیال اگرچہ بڑا رومانوی سا ہے لیکن اس خیال سے مستقبل کے سائنس دانوں کو تحقیق کی کوئی نئی راہ سوجھ سکتی ہے۔

ویلز کی سب سے ہنگامہ خیز کتاب اس کی زندگی کا آخری سائنسی ناول "آئندہ آنے والی چیزوں کی شکلیں" ہے۔ یہ کتاب ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی۔ اس ناول میں ویلز نے دوسری جنگ عظیم کی پیش گوئی کر دی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ دوسری جنگِ عظیم ۱۹۴۰ء کے آس پاس شروع ہو جائے گی اور اس میں دنیا کی تمام بڑی قومیں شریک ہوں گی۔ ویلز نے اس کتاب میں ٹیلی وژن، ایئر کنڈیشنر، ویڈیو ٹیپ ریکارڈ وغیرہ کے وجود میں آنے کی پیش گوئی بھی کی ہے۔ البتہ اس کا خیال تھا۔ کہ چیزیں ۲۰۵۴ء کے آس پاس وجود میں آئیں گی۔ ویلز کے خیال کے برعکس یہ چیزیں ایک صدی پہلے ہی وجود میں آ چکی ہیں۔

جدید سائنس فکشن کے دوسرے باوا آدم جولیس ورن بھی تخیلاتی دنیا تخلیق کرنے کے معاملے میں ایچ جی ویلز سے کم نہ تھا۔ ان دونوں کے درمیان بس ایک فرق تھا اور وہ یہ کہ ویلز ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ سائنس دان بھی تھا۔ جبکہ ورن محض ایک ادیب تھا۔ جدید دور کے پہلے سائنسی ناول میں ورن نے خلا بازی اور اس سے متعلق پروگرام کی پیش گوئی کر دی تھی۔ یہ ناول ۱۸۶۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اس ناول کے تین کردار خلا باز ایک بڑے سارے سیلنڈر کے ذریعہ خلا میں جاتے ہیں اور پھر جب زمین پر واپس آتے ہیں تو سمندر میں اُترتے ہیں۔ یہ بالکل وہی طریقہ ہے جو جدید راکٹ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ کتنی حیرت انگیز بات ہے!

ورن نے اپنی تحریروں میں بعض ایسی باتوں کی پیش گوئیاں بھی کی ہیں جو اگرچہ ابھی تک پوری نہیں ہوئیں لیکن ممکن ہے مستقبل میں ہو جائیں۔ مثلاً ورن نے خیال ظاہر کیا ہے کہ آئندہ برسوں میں زمین کے انسانوں کی خوراک کا منبع سمندر ہوگا۔ نیز آئندہ سالوں میں انسان سمندر میں دفن ہو جانے والے برِاعظم اٹلانٹس کے کھنڈرات کو دریافت کرے گا۔

ورن نے اپنی ایک اور کتاب "ساٹھ ہزار میل گہرے سمندر میں" جو کہ ۱۸۷۳ء میں شائع ہوئی۔ سمندر کے اندر تحقیق و دریافت کے لیے کام میں آنے والے تقریباً تمام آلات کا خاکہ پیش کیا ہے۔ ورن نے اپنی اسی کتاب میں ایک ایسی آبدوز کا تصور بھی پیش کیا ہے جو خود کار ہونے کے ساتھ ساتھ اس خصوصیت کی حامل بھی ہے کہ وہ جب چاہے سمندر کی تہہ تک غوطہ لگا سکتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے نا کہ اب ایسی آبدوزیں تیار ہو چکی ہیں!

تخیل کی دولت سے مالا مال یہ ادیب اگر آج زندہ ہوتے تو اپنے تخیل کو حقیقت کا روپ دھارتے دیکھ کر معلوم نہیں کتنا خوش ہوتے؟

وہ لوگ جو ادیبوں اور شاعروں کو خیالی پلاؤ پکانے والی مخلوق سمجھتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ مضمون پڑھ کر اُن کی رائے میں کوئی تبدیلی آئے گی یا نہیں؟ اگر کسی قاری کی رائے بدلے تو ہمیں ضرور اطلاع دے۔

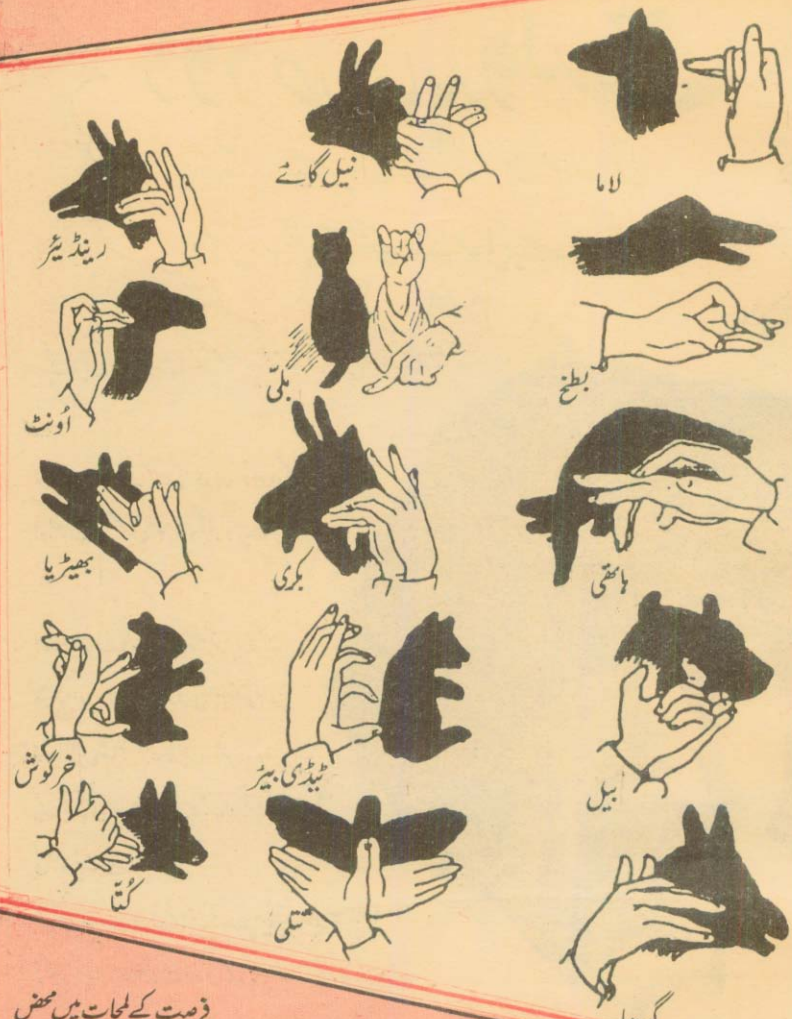

فرصت کے لمحات میں محض

اپنے ہاتھوں کے مختلف زاویوں کی مدد سے آپ بہت سے جانور بنا کر خود بھی محظوظ ہو سکتے ہیں اور اپنے دوستوں کو بھی حیران کر سکتے ہیں۔ ہاتھوں کے انداز کو سامنے رکھتے ہوئے آپ ذرا سی کوشش کے بعد یقیناً کامیاب ہو جائیں گے۔

دُودھ کی بدولت

ریشم جیسے بال — نرم ملائم کھال

روشن روشن آنکھ — موتی جیسے دانت

کہتے ہیں کہ "صحت مند جسم صحت مند ذہن کی علامت ہے"

ماہرین برسوں کی تحقیق کے بعد دُودھ کو مکمل غذا اور صحت مند جسم کی ضمانت قرار دیتے ہیں۔

اللہ میاں نے دُودھ میں کیلشیم، پروٹین وٹامنز اور بہت سے معدنی اجزا متوازن مقدار میں شامل کر دیے ہیں۔ یہی وہ اجزا ہیں جو اچھی صحت، بیدار ذہن اور خوشگوار زندگی کی ضمانت ہیں۔

اگر آپ نے ہر روز دو گلاس دُودھ پینا اپنی عادت بنا لیا تو گویا آپ نے صحت مندی کا راز پا لیا۔

دائی کی بات سنو
دُودھ پیو — مضبوط بنو

اشتہار برائے بہبود اطفال، منجانب آنکھ مچولی۔ کراچی

MASS

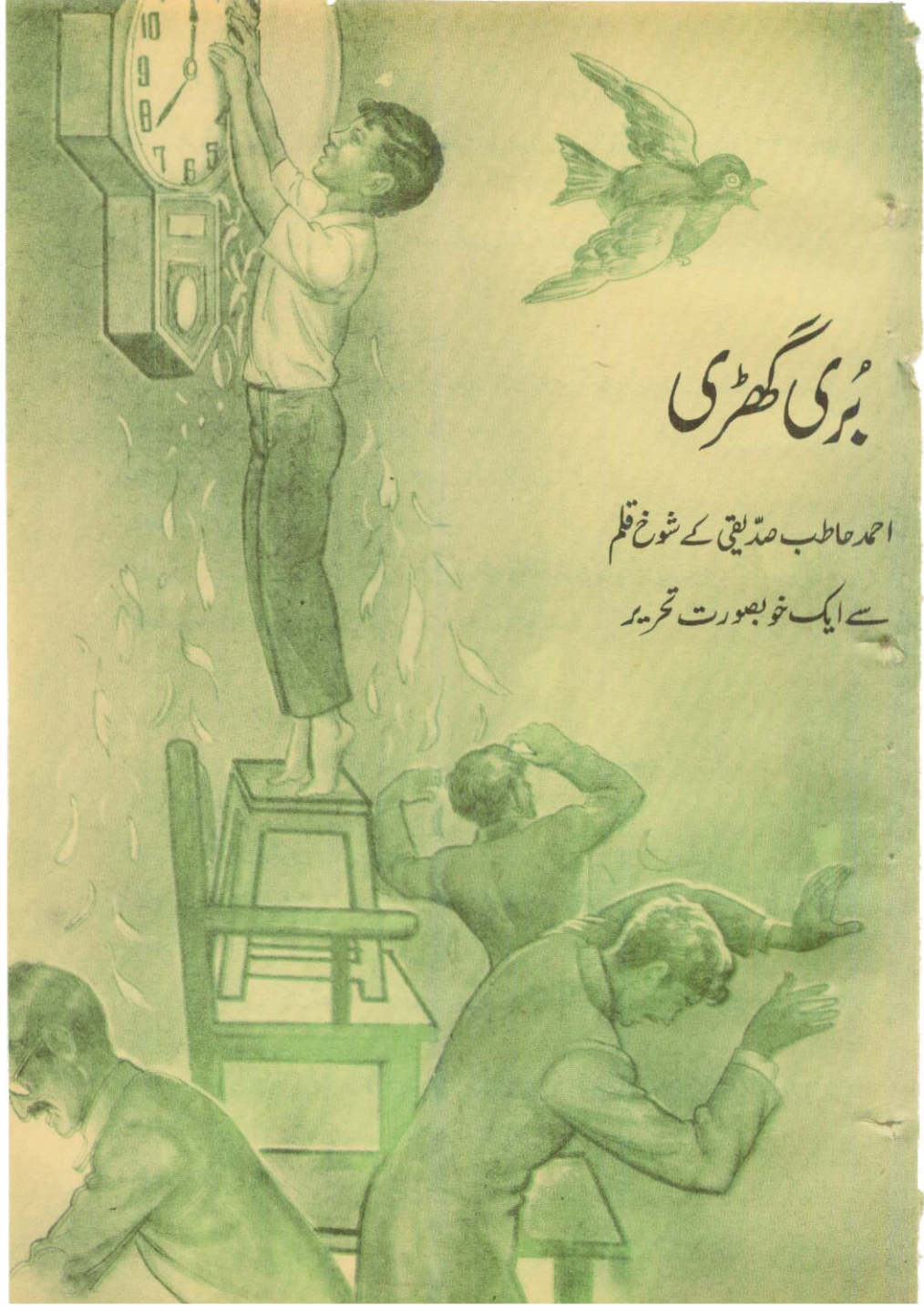

بُری گھڑی

احمد حاطب صدّیقی کے شوخ قلم

سے ایک خوبصورت تحریر

" "ٹن ٹن ٹن!" "ٹن ٹن ٹن" "ٹن ٹن ٹن"

اسکول کے گھڑیال نے نو بجائے، چپراسی نے اسکول کا گھنٹہ بجایا اور سارے بچے دُعا کے لیے قطار بنا کر اسمبلی ہال میں جمع ہو گئے۔

پانچویں جماعت کے راشد بھائی نے تلاوت کی۔ سب بچوں نے مل کر قومی ترانہ پڑھا۔ اسلامیات کے سَر نے چند اچھی اچھی باتیں بتائیں اور دُعا کرانے لگے۔

لیکن شرفو شریر کا دھیان اُس طرف بالکل نہیں تھا۔

نام تو اُس کا شریف الدین تھا، لیکن کام سارے غیر شریفانہ۔ ایسی ایسی شرارتیں اور شیطانیاں کرتا تھا کہ خدا کی پناہ۔ سارا اسکول اُس کو "شرفو شریر" کے نام سے پکارتا تھا۔

اپنا کام تو کبھی کر کے لانا نہیں، ہمیشہ دوسروں کے کام میں ٹانگ اڑاتا رہتا تھا۔

اس وقت بھی اُس کی ساری توجہ وال کلاک کی طرف تھی۔

اُس نے گھونسلے سے تنکے اور پَر نکال نکال کر بغیر دیکھے نیچے پھینکنا شروع کر دیا۔ کچھ ایک ماسٹر صاحب کے سر پر گرے کچھ دوسرے ماسٹر صاحب کی قمیض کے اندر گھس گئے۔ وہ دونوں بیچارے!

"ارے شرفو! ارے شرفو!"

کہتے ہوئے اپنا سر اور گردن جھاڑنے میں مصروف ہو گئے۔

چڑیا نے شرفو کی یہ حرکتیں دیکھیں تو وہ غصّے میں آگے بڑھی اور شرفو کی ناک پر ایک چونچ رسید کی۔

"ہُش ہُش!"

شرفو میاں ذرا ڈگمگائے مگر خدا کا شکر ہے کہ جلدی سنبھل گئے۔

اب چڑیا پھر ان کی طرف بڑھی انھوں نے اپنا منہ بچانے کو ہاتھ منہ کے سامنے لانے کی کوشش کی تو وال کلاک پھر گھوم گیا اور ان کی آستین اس کی سوئیوں میں پھنس گئی۔

شرفو میاں نے جھٹک کے آستین نکالی تو گھڑی کی سوئیاں پورے ایک گھنٹہ پیچھے ہو گئیں یعنی ساڑھے نو کے بجائے ساڑھے آٹھ بجانے لگیں۔

دراصل جب کلاک نے نو بجائے تو اُس کا "ٹن ٹن" ختم ہو جانے کے بعد اُس میں سے "چوں چوں" کی آوازیں آنے لگیں۔ "چوں چوں" کی اُنھی آوازوں نے "شرفو شریر" کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔

اچانک اُس نے ایک چڑیا کو وال کلاک کے پچھلے حصّے سے اُڑ کر جاتے ہوئے دیکھا۔

"ارے! وہ دیکھو! وال کلاک میں چڑیا اپنا گھونسلہ بنا رہی ہے۔"

وہ دعا کے دوران ہی چیخ پڑا۔ اور ہر شخص کی توجہ اُسی طرف ہو گئی۔

"چُوں چُوں"

چڑیا پھر اُڑ کر آ گئی ایسا لگتا تھا کہ اُس نے بھی "شرفو شریر" کی چیخ پکار سُن لی تھی۔

"چڑیا نے اگر وال کلاک کے اندر گھونسلہ بنا لیا تو گھڑی تو رُک جائے گی"۔ ماسٹر صاحب نے بھی دُعا ختم کراتے ہوئے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔

"کسی گھڑی ساز کو بُلانا چاہیے" ایک دوسرے ماسٹر صاحب نے مشورہ دیا۔

"سر میں خود یہ گھونسلا صاف کر سکتا ہوں۔"

شرفو شریر نے چلا کر ماسٹر صاحب سے کہا۔

"نہیں! یہ تمہارے بس کی بات نہیں، کلاک اوپر ہے تم کیسے صاف کر سکو گے؟"

"سر آپ دیکھیں تو سہی!" یہ کہہ کر شرفو شریر نے دوڑ لگائی اور تھوڑی ہی دیر میں ہانپتا ہُوا واپس آ گیا۔

"سر اسکول کی سیڑھی تو مرمت کے لیے گئی ہوئی ہے، خیر کوئی بات نہیں میں ایک اور ترکیب نکالتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اُس نے ایک میز گھسیٹی، اس کے اوپر ایک کُرسی رکھی اور کُرسی پر اسٹول رکھ کر چڑھنے لگا۔

ماسٹر صاحب ہنسے۔

"شرفو! یہ تمہارے بس کی بات نہیں اُتر جاؤ!"

"سر دیکھتے رہیے میں کیسے کام کرتا ہوں۔"

شرفو صاحب اتنی دیر میں اسٹول پر بھی چڑھ چکے تھے۔

"یہ تو سرکس کا مسخرا لگتا ہے۔" دوسرے ماسٹر صاحب بھی ہنسنے لگے۔

"شرفو! اب بھی بات مان لو ورنہ تم کو خود اپنے کیے کی سزا مل جائے گی!"

دوسرے ماسٹر صاحب بھی نرمی سے بولے۔ ان کو معلوم تھا کہ اگر اس وقت شرفو شریر کو زبردستی روک دیا گیا تو وہ کسی اور وقت یہ فرض انجام دینے لگے گا اور اکیلے میں کوئی اس کا ہاتھ پیر ٹوٹنے سے بچانے والا بھی نہیں ہوگا۔ پھر اب تو وہ چڑھ ہی چکا تھا۔ وہ کیا کر سکتے تھے۔

شرفو شریر نے وال کلاک کی چٹخنی کھول کر اس کو گھما لیا۔ اب اُس کا پچھلا حصّہ سامنے آ گیا تھا۔ جس میں چڑیا آدھے سے زیادہ گھونسلا بنا چکی تھی۔

چڑیا ایک بار پھر اُن کی طرف بڑھی اور شرفو میاں بچنے کی کوشش کرتے ہوئے "اڑا اڑا دھڑم!" ایک دھماکے کے ساتھ نیچے آرہے۔

بچے ہی نہیں ماسٹر صاحب بھی ڈر کر اِدھر اُدھر بھاگے تاکہ اسٹول، کرسی یا میز ان کے اوپر نہ آگرے۔ شرفو میاں ہاتھ پیر سہلاتے ہوئے اُٹھے اور منہ لٹکا کر، سر جُھکا کر ایک طرف کھڑے ہوگئے۔ وال کلاک کا دروازہ خود بخود بند ہو چکا تھا۔ مگر سوئیاں تو ساڑھے آٹھ ہی بجا رہی تھیں، اس کی طرف کسی نے توجہ ہی نہیں دی۔

دونوں ماسٹر صاحبان نے سخت ڈانٹ ڈپٹ کی اور کہا کہ۔

"سزا تو تمہیں خود ہی مل چکی ہے، لیکن خبردار آئندہ کسی ایسے کام میں ہاتھ مت ڈالنا۔ جو تمہارے بس کا نہ ہو۔ اور ہاں تمہارا آج کا انٹرول بند!"

بے چارے چپراسی کے پاس تو گھڑی تھی نہیں۔ اُس نے اسی وال کلاک سے ٹائم دیکھ کر انٹرول کا گھنٹہ بجایا۔ جو ظاہر ہے کہ ساڑھے دس کے بجائے ساڑھے گیارہ بجے بجایا گیا، مگر گھڑی میں تو ساڑھے دس ہی بجے تھے۔ ماسٹر صاحب کو بھی محسوس ہُوا کہ آج انٹرول کا گھنٹہ بہت دیر میں بجا ہے، مگر وہ پڑھانے میں اتنے مصروف تھے کہ اصل بات کی طرف اُن کا بھی دھیان نہیں گیا۔

انٹرول میں سارے بچے تو کھیلنے کُودنے میں مصروف رہے، مگر شرفو میاں کلاس میں اکیلے بیٹھے رہے۔

اسی طرح چھٹی کا گھنٹہ بھی ایک بجے کے بجائے دو بجے بجایا گیا۔ اب جو ماسٹر صاحب نے اپنی گھڑی سے اسکول کی گھڑی ملائی تو ان کو پتا چل گیا کہ شرفو میاں کی کارکردگی کی وجہ سے اسکول کی گھڑی ایک گھنٹہ پیچھے ہوگئی ہے۔ اب تو اُن کو بھی غصّہ آیا اور اُنھوں نے شرفو شریر کو وہ بید رسید کیے کہ عمر بھر یاد رہیں گے۔

لیکن شرفو کی مصیبت یہیں ختم نہیں ہوگئی۔ گھر پہنچے تو امّی جان بھی ڈنڈا لیے ان کی منتظر تھیں۔

"اسکول کی چھٹی تو ایک بجے ہو جاتی ہے اور تم اب ڈھائی بجے آرہے ہو؟ ایک گھنٹے تک سڑکوں پر گھومتے رہے؟ ٹھہرو ابھی بتاتی ہوں!"

اب آپ ہی بتائیے کہ شرفو میاں اپنی امّی کو کیا بتاتے۔ سارا کیا دھرا خود اُنہی کا تھا۔ اب وہ سوچنے لگے کہ

"کاش میں ماسٹر صاحب کو گھڑی والے کو بُلانے دیتا تو ایسی بُری گھڑی تو مجھ پر نہ پڑتی!"

منتخب لطائف
اور مزے دار کارٹونز کے
کھٹ مٹھے

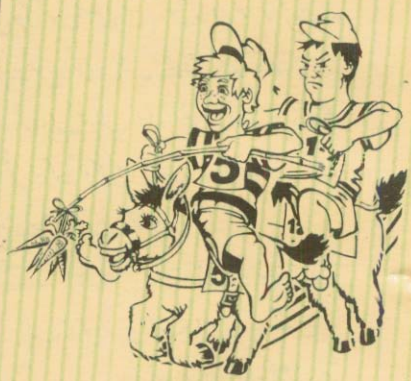

انعامی لطیفہ

ٹرین میں ایک اخباری رپورٹر نے ایک انتہائی معمر لیکن خوب تندرست و توانا آدمی کو بیٹھے دیکھا تو اس سے اتنی اچھی صحت کا راز پوچھا

معمر آدمی: "پتا نہیں میری اچھی صحت کا راز کیا ہے؟ دنیا جہاں کا نشہ میں کرتا ہوں، دس دس پیکٹ سگریٹ کے پی جاتا ہوں۔"

اخباری رپورٹر: "حیرت ہے! اچھا آپ کی عمر کیا ہے؟"

معمر آدمی: "پچیس سال۔"

سیّد انور سعید کاظمی - ملتان

ایک سیّاح کسی جگہ کی سیر کر رہا تھا۔ گائیڈ نے اُس شہر کے کھنڈرات دکھاتے ہوئے کہا "ٹھیک ۵ بجکر ۱۰ منٹ پر ہولناک زلزلہ آیا اور آس پاس کی عمارتیں ایک سیکنڈ میں ملبے کا ڈھیر بن گئیں" سیّاح نے ایک مینار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "لیکن یہ مینار کس طرح بچ گیا"؟ "اِس مینار کی گھڑی پانچ منٹ آگے تھی۔ گائیڈ نے جواب دیا۔"

عظمت اللہ کھوکھر صادق آباد

ایک صاحب نے کرائے پر نیا مکان حاصل کیا کچھ دن بعد ایک نووارد ان کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ نئے پڑوسی ہونے کی حیثیت سے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، لیکن آپ خرّاٹے ذرا آہستہ لیا کریں، میری آنکھ کھُل جاتی ہے۔"

وضاحت چاہی گئی "آپ کی تعریف؟"

جواب ملا "جناب! میں آپ کے محلّے کا چوکیدار ہوں۔۔۔"

ممتاز احمد قریشی مکلی (ٹھٹھہ)

استاد (شاگرد سے) "انڈے اور ڈنڈے کا فرق بتاؤ؟"

شاگرد: "جناب! انڈا پیٹ کے اندر جا کر جسم کو گرم کرتا ہے جبکہ ڈنڈا باہر ہی سے گرم کر دیتا ہے۔"

ابنِ مفرح - مردان

ایک امیر شخص اپنے سے کم حیثیت کے دوست کو اپنی نئی کار دکھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"میری کار میں ہر چیز خود کار ہے۔ مثلاً اس نیلے بٹن کو دباؤ تو بونٹ خود بخود کھل جاتا ہے۔ اس سفید بٹن کو دباؤ تو شیشے خود بخود نیچے آجاتے ہیں۔"

دوسرے دوست سے نہ رہا گیا اور اُس کی بات کاٹ کر بولا۔

"میری کار بھی خود کار ہے۔ مثلاً جب میں اُس کا اگلا دروازہ کھولتا ہوں تو پچھلا دروازہ خود بخود کھل جاتا ہے اور جب میں دروازہ زور سے بند کرتا ہوں تو کھڑکیوں کے شیشے خود بخود نیچے گر جاتے ہیں۔"

خرم عبدالحمید بٹ - گلشن اقبال، کراچی

ایک افسر نے اپنے ماتحت سے شرارتاً پوچھا۔

"تمہارے والد کون تھے۔؟"

"صاحب! موچی تھے" ماتحت نے جواب دیا۔ افسر نے ماتحت کو شرمندہ کرنے کے لئے کہا "تو پھر انہوں نے تمہیں موچی کیوں نہیں بنایا؟" تھوڑی دیر بعد ماتحت نے افسر سے پوچھا "جناب آپ کے والد کون تھے۔"؟

"وہ ایک شریف آدمی تھے" افسر نے لاپرواہی اور قدرِ فخر سے کہا "تو پھر وہ بھی آپ کو اپنے جیسا بنانے میں ناکام رہے" ماتحت نے جواب دیا۔

سید سلمان لیاقت آباد کراچی

ایک آدمی کسان سے: "کیا میں آپ کے کھیت سے گزر سکتا ہوں۔ دراصل مجھے چھ والی ٹرین پکڑنی ہے"

کسان: "گزر جاؤ، لیکن اگر میرے کتے نے دیکھ لیا تو آپ کو ایک گھنٹے تک اسٹیشن پر ٹرین کا انتظار کرنا پڑے گا۔"

شفیق الرحمٰن نامعلوم

ایک شخص موڈ سے نمودار ہوا اور اُس نے ایک راہ گیر سے پوچھا: "آپ نے اِدھر کوئی پولیس مین تو نہیں دیکھا؟"

"نہیں تو" راہ گیر نے جواب دیا۔

"تو پھر نکالو جو کچھ بھی تمہارے پاس ہے۔" اُس شخص نے کہا۔

اعجاز احمد، گجرات

ایک صاحب کے گھر اُن کے ایک دوست آپہنچ گئے، جو بہت دیر تک بیٹھے رہے، گھر سے نکلنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے یہاں تک کہ کھانے کا وقت آگیا مجبوراً اُن صاحب نے دوست کو کھانے کے لیے کہا۔ دوست نے بے تحاشا کھانا شروع کر دیا وہ کھا ہی رہے تھے کہ انھیں ایک چھینک آئی تو کہنے لگے شاید باپ نے یاد کیا ہوگا۔ پھر دوسری چھینک آئی تو کہنے لگے، بیوی نے یاد کیا ہوگا، تیسری چھینک آئی تو کہنے لگے 'اب میرا بچہ مجھے یاد کر رہا ہوگا۔ وہ اسی طرح ہر چھینک پر کسی نہ کسی کی یاد کا بہانہ کرتے رہے آخر میں جب اُنھیں ایک زوردار چھینک آئی تو میزبان نے کہا: "سب گھر والے تمھیں یاد کریں یا نہ کریں لیکن اب تمھیں ڈاکٹر ضرور یاد کر رہا ہوگا۔

عبدالوہاب نارتھ کراچی

مریض (ڈاکٹر سے) "ڈاکٹر صاحب! مجھے نیند نہیں آتی۔"

ڈاکٹر "تم کام کیا کرتے ہو۔؟"

مریض "میں موٹر مکینک ہوں۔"

ڈاکٹر "اچھا تو اس میز کے نیچے لیٹ جاؤ نیند آجائے گی۔"

مینا دلی آریہ محلہ، راولپنڈی

مریض (ڈاکٹر سے) "مجھے اور کوئی مرض نہیں۔ صرف سونے کے بعد سے لے کر جاگنے تک خراٹے بھرتا ہوں۔

ڈاکٹر: "تو پھر یہ گولیاں لے جاؤ۔ ایک سونے کے بعد دوسری جاگنے سے پہلے کھا لینا۔!"

سید جاوید حیدر شاہ۔ سیٹلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی

ایک آدمی کو پاگل کُتّے نے کاٹ لیا۔ وہ ڈاکٹر کے پاس گیا تو ڈاکٹر نے کہا کہ "اب تم بھی پاگل ہو جاؤ گے اور جسے کاٹو گے وہ فوراً مر جائے گا۔" یہ سُنتے ہی اُس نے ڈاکٹر سے کاغذ پنسل طلب کیے۔ ڈاکٹر نے پوچھا "کیا وصیّت لکھنی ہے؟" اُس نے جواب دیا "جی نہیں میں اُن لوگوں کی فہرست بنانا چاہتا ہوں جن کو میں کاٹوں گا۔"

سمیع اللہ خان النور شوگر ملز

بادشاہ (مسخرے سے) "اچھا ہُوا تم آگئے۔ اس وقت میرا جی کسی مسخرے سے باتیں کرنے کو چاہ رہا تھا۔"

مسخرہ "میں بھی یہی سوچ کر حاضر ہُوا ہوں"

سیّد وجاہت علی شاہ گیلانی گولارچی (سندھ)

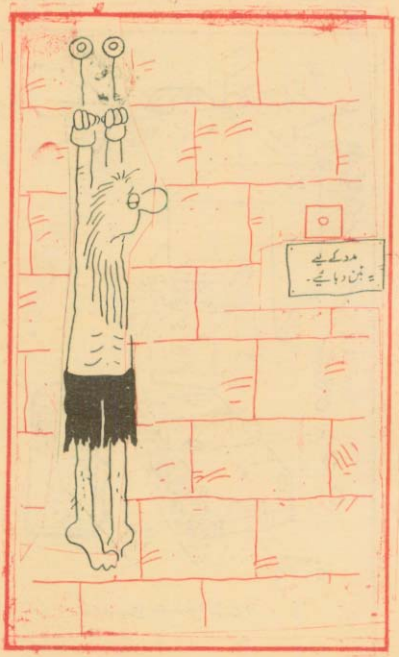

ملازم ہوٹل مینیجر سے: "جناب، اُوپر کا مسافر شکایت کر رہا تھا کہ رات بارش میں چھت اس قدر ٹپکی کہ وہ سر سے پاؤں تک نہا گیا"

مینیجر: "ٹھیک ہے اس کے بل میں نہانے کے پیسے بھی شامل کر لو"

حامد علی شاہ تلہ گنگ

فاروق: ناصر سے، "میرے چھوٹے بھائی نے آج تک جھوٹ نہیں بولا"

ناصر: "اچھا! کیا وہ بہت صاف گو ہے"

فاروق: "نہیں یہ بات نہیں ہے۔ وہ بچپن سے گونگا ہے"

حنا شہزاد فارحہ ناظم آباد، کراچی

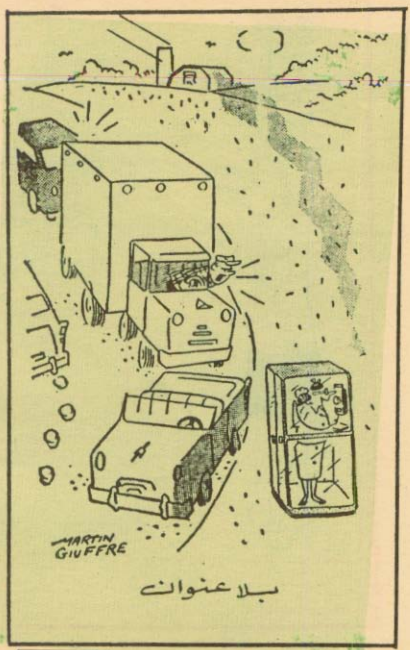

بلا عنوان

بلا عنوان

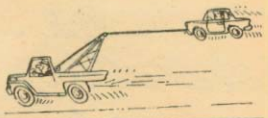

بیوی نے شوہر سے پوچھا "آخر آپ نے کس بات سے یہ اندازہ لگایا کہ ہمارا بیٹا بڑا ہو کر سیاستدان بنے گا؟"

"ہمارا بیٹا ایسی باتیں کرتا ہے جو کانوں کو بھلی لگتی ہیں، لیکن غور کریں تو اُن کا کوئی مطلب نہیں ہوتا" شوہر نے جواب دیا۔

کرن شریف۔ سکھر

ایک چوہدری صاحب اپنے نوکر کے ساتھ شکار کو گئے جنگل پہنچ کر چوہدری صاحب بندوق تان کر کھڑے ہو گئے ایک طرف جھاڑیوں میں کچھ سرسراہٹ ہوئی۔ چوہدری صاحب نے جھٹ بندوق کا رُخ اُدھر کیا اور لبلبی دبا دی۔

"بھاگ کر جاؤ اور میرے شکار کیے ہوئے جانور کا نام مجھے آکر بتاؤ" چوہدری صاحب نے نوکر سے کہا۔

نوکر تھوڑی دیر بعد واپس آیا اور بولا "حضور! وہ اپنا نام علم دین بتاتا ہے"

سید اطہر سعید کاظمی ملتان

ایک کنجوس ایک روپے کا نوٹ مٹھی میں دبائے چلا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے مٹھی کھولی تو اُس کی ہتھیلی میں پسینہ تھا۔ کنجوس نے کہا "نہ رو میرے پیارے میں تجھے خرچ نہیں کروں گا"

ضمیر احمد شیخ، حیدر آباد

ایک ایسی کہانی جسے پڑھتے ہوئے
آپ اپنے آپ کو خواب اور حقیقت کے
درمیان جھولتا ہوا محسوس کریں گے۔

سلسلے وار سائنسی ناول

عکس

شاہنواز فاروقی

قسط نمبر ۲

۲۰۴۰ء کا زمانہ۔ سرمد ایک میوزیم میں منتظم کے عہدے پر فائز ہے۔ سرمد کے بچپن کا دوست حارث پاکستان کرکٹ ٹیم کا کھلاڑی ہے۔ ایک دن سرمد حارث کے ہلاوے پر کرکٹ میچ دیکھنے کے لیے اسٹیڈیم گیا۔ حارث نے اس میچ میں اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ بائیں ہاتھ سے بولنگ کر کے انگلستان کی ٹیم کو دونوں اننگز میں انتہائی کم اسکور پر آؤٹ کر دیا۔ حارث کی ناقابل یقین حد تک حیرت انگیز بولنگ پر ہر شخص حیران رہ گیا۔ میچ کے اختتام کے بعد حارث ایک نامعلوم کار میں بیٹھ کر کہیں چلا گیا۔ ایک ہفتہ تک کسی کو پتا نہ چلا کہ حارث کہاں ہے... پھر حارث کی طرف سے ایک اخبار کو اطلاع ملی کہ وہ جب تک خود منظر عام نہ آجائے اُسے تلاش نہ کیا جائے۔ حارث کی اس پُراسرار گمشدگی نے پوری دنیا کو حیران کر دیا تھا۔ کچھ دنوں بعد حارث خود منظر عام پر آگیا۔ ایک دن سرمد کو اپنے ایک اور بچپن کے دوست فراز کا ٹیلی فون موصول ہُوا۔ فراز سرمد سے فوراً ملنا چاہتا تھا۔ فراز نے فون پر سرمد کو بتایا کہ وہ اس سے حارث کے متعلق کچھ باتیں کرنا چاہتا ہے۔ سرمد نے فراز کو رات کے کھانے پر اپنے گھر مدعو کر لیا' اور پھر فراز کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

اس کے بعد کیا ہوا ملاحظہ کیجیے

ٹھیک نو بجے جب اندھیرے نے ہر چیز کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ گھر کی کال بیل چیخ اُٹھی۔ میں نے گھر کے دروازے پر لگے ہوئے کیمرے کا بٹن دبایا تو فراز کی تصویر گیلری میں آویزاں اسکرین پر نمودار ہو گئی۔ میں نے پہلے ہوئے گھر کا دروازہ کھول دیا۔ فراز میرے سامنے کھڑا تھا۔

اگر آپ عرصہ کے بعد اپنے کسی شناسا سے ملیں تو وہ کچھ بدلا بدلا سا لگتا ہے۔ فراز بھی جیسے کچھ بدل گیا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ سنجیدہ اور خاموش نظر آ رہا تھا، لیکن اس کے علاوہ بھی اُس میں کچھ تبدیلیاں آئی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں، لیکن وہ تبدیلیاں کیا تھیں یہ بتانا میرے لیے مشکل تھا۔ فراز مجھے دیکھتے ہی لپٹ گیا۔

"اتنے دنوں سے کہاں ہو گندے بچے؟" میں نے فراز سے لپٹ کر اس کی پیٹھ کو پیار سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"معلوم نہیں" فراز نے فلسفیانہ سا جواب دیا ؎

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی خود ہماری خبر نہیں آتی۔

میں نے فراز سے الگ ہو کر اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے میر کا شعر پڑھا۔ فراز لمحہ بھر کو آنکھیں بند کر کے مُسکرایا جیسے کہہ رہا ہو "تم ٹھیک سمجھے"۔

پھر ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔ کچھ دیر بعد ہم رات کا کھانا کھانے میں مصروف ہو گئے۔ کھانے کی میز پر فراز کی پسند کی کئی چیزیں موجود تھیں۔

میں نے میز پر بیٹھتے ہی فراز پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ مثلاً تم پچھلے پانچ برسوں میں کیا کرتے رہے؟ تحقیقی کام کیسا چل رہا ہے؟ کہاں رہ رہے ہو؟ شادی کر لی یا نہیں؟ وغیرہ فراز نے میرے ہر سوال کا نہایت مختصر جواب دیا۔ کسی بڑے سرکاری افسر کی طرح۔ میں نے دورانِ گفتگو محسوس کیا کہ فراز جان بوجھ کر زیادہ بولنے سے گریز کر رہا ہے۔ اور اس کی کوشش ہے کہ میں ہی بولتا رہوں۔ کھانا کھاتے ہوئے میں نے فراز میں کچھ اور تبدیلیاں بھی نوٹ کیں۔ مثلاً پہلے وہ جلدی جلدی کھانا کھانے کا عادی تھا۔ سنجیدگی کے باوجود اس میں شگفتگی پائی جاتی تھی اور وہ کسی ہنسنے والی بات پر خوب زور کا قہقہہ لگایا کرتا تھا۔ ہم اُس کے قہقہہ کو مذاق میں ہلاکو خان کا قہقہہ کہا کرتے تھے، لیکن اب اُس کی ذہین آنکھوں میں گہری اُداسی تھی۔ اُس سے باتیں کرتے ہوئے مجھے بار بار یہ احساس ہوا کہ وہ کسی خاص موضوع پر گفتگو کرنا چاہتا ہے، لیکن کوئی جھجک اُسے روک دیتی ہے۔ میرے دل میں طرح طرح کے شکوک سر اُٹھا رہے تھے، لیکن میں اُن شکوک کو حقیقت سمجھنے سے قاصر تھا، کیونکہ میرے پاس انہیں حقیقت سمجھنے کے لیے کوئی دلیل نہیں تھی۔ کھانا ختم ہوتے ہی ایک عجیب واقعہ ہوا اور میرے شکوک پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گئے۔

ہُوا یہ کہ میرا بیٹا بہزاد جو کبھی فراز سے بہت مانوس تھا۔ اپنے ہاتھ میں کہانیوں کی ایک کتاب اُٹھائے فراز کے پاس آیا اور اُسے کتاب دکھاتے ہوئے بولا

"فراز چاچا! یاد ہے آپ نے یہ کتاب مجھے تحفے میں دی تھی مگر آپ اس پر اپنے دستخط کرنا بھول گئے تھے میں نے سوچ رکھا تھا کہ جب آپ آئیں گے تو اس پر دستخط کرالوں گا" یہ کہہ کر اُس نے کتاب فراز کی جانب بڑھا دی

کتاب کے اندرونی صفحہ پر فراز کی ہینڈ رائٹنگ میں لکھا تھا "پیارے بھتیجے بہزاد کے لیے پیار کے ساتھ"

فراز نے بے چینی کے ساتھ پہلو بدلتے ہوئے کتاب لے لی اور اُسے اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور یہ کہتے ہوئے بہزاد کو واپس کر دی کہ "آج میری آنکھوں میں تکلیف ہے اور پھر میں اپنا چشمہ بھی گھر بھول آیا ہوں، لیکن وعدہ رہا اگلی بار آؤں گا تو ضرور دستخط کر دوں گا"

"مگر چاچا پہلے تو آپ چشمہ نہیں لگاتے تھے؟" بہزاد نے کتاب ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں بیٹے ... مگر اب لگاتا ہوں" فراز نے گھبرا کر بہزاد کی جانب دیکھتے ہوئے مصنوعی مسکراہٹ چہرے پر لا کر کہا۔

فراز کی یہ حرکت اگرچہ بڑی عجیب تھی، لیکن میں نے اپنے چہرے سے کسی حیرت کا اظہار نہ ہونے دیا۔

کھانے کے بعد میں فراز کو لے کر اپنی ویڈیو کیسٹ لائبریری میں چلا گیا۔ لائبریری میں داخل ہو کر فراز نے بڑے غور سے پورے کمرے کا جائزہ لیا۔

"مجھے امید ہے کہ اگر تم جنگل میں ایک جھونپڑی بنا کر بھی رہو گے تو وہاں بھی ایک لائبریری ضرور ہو گی" فراز یہ کہتا ہوا صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد چند لمحوں تک ہمارے درمیان خاموشی رہی پھر میں نے اُس سے سنجیدگی کے ساتھ پوچھا۔

"ہاں تو تم حارث کے بارے میں مجھے کچھ بتانا چاہ رہے تھے؟"

آرام دہ صوفے پر بیٹھے ہوئے فراز نے میری جانب ٹھہری ہوئی نظر سے دیکھا اور پھر جیب سے کافی کی گولیوں کا پیکٹ نکال کر اُس میں سے ایک گولی منہ میں ڈالتے ہوئے بولا۔

"میں تم سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہوں، حارث کے بارے میں بھی اور کئی دوسری چیزوں کے بارے میں بھی لیکن باتوں سے پہلے میں تمہیں ایک چیز دکھانا چاہتا ہوں"

یہ کہتے ہوئے اُس نے جیب سے ایک پیکٹ نکالا اور آہستہ سے اُسے کھول دیا۔ پیکٹ میں پتھر سے بنی ہوئی بدھ مذہب کے بانی مہاتما بدھ کی ایک مورتی موجود تھی۔ اُس مورتی کی اہمیت سے میں بخوبی واقف تھا۔ کیونکہ اسی طرح کی ایک مورتی اُس میوزیم میں بھی موجود تھی جس میں میں کام کرتا تھا۔

اس مورتی کے بارے میں ماہرینِ آثارِ قدیمہ کا خیال تھا کہ یہ مورتی دُنیا بھر میں اپنی نوعیت کی واحد مورتی ہے یہ مورتی پاکستان کے شمالی علاقوں میں ہونے والی کھدائی میں برآمد ہوئی تھی۔ سوال یہ تھا کہ ٹھیک ویسی ہی مورتی فراز کے پاس کہاں سے آئی؟ میرے میوزیم میں رکھی ہوئی مورتی اور فراز کے ہاتھ میں موجود مورتی میں غور سے دیکھنے

پر صرف ایک فرق نظر آتا تھا، اور وہ یہ کہ فراز کے پاس جو مورتی تھی اس میں مہاتما بدھ کا دایاں ہاتھ بائیں جانب کو خم کھایا ہُوا تھا۔

میں نے فراز سے مورتی لے کر آلات کی مدد سے اُس کی جانچ کی تو میں یہ جان کر حیران رہ گیا کہ مورتی نقلی نہ تھی۔

"کیوں جناب! ہے نا اصلی اور نایاب شے۔"

فراز پہلی بار فطری طور پر مُسکراتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہُوا۔

"بے شک یہ اصلی اور نایاب شے ہے۔ ایسی ہی ایک مورتی میرے میوزیم میں موجود ہے، لیکن اُس میں اور تمہاری مورتی میں ایک فرق ہے اور وہ یہ کہ تمہاری مورتی میں مہاتما بدھ کا دایاں ہاتھ بہت معمولی سا بائیں جانب کو خم کھایا ہُوا ہے۔"

"اچھا!" فراز نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ اُس کی چیخ میں حیرت سے زیادہ شرارت نمایاں تھی۔

"ہاں بس یہی ایک فرق ہے" میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"اچھا تمہیں فرصت ہو تو مجھے اپنے میوزیم میں رکھی ہوئی مورتی دکھانا۔ ویسے مجھے شک ہے کہ تمہارے میوزیم میں اس طرح کی مورتی موجود ہے۔"

"کیوں تمہیں کس بنیاد پر شک ہے؟" میں نے حیران اور پریشان ہوتے ہوئے پوچھا۔

"اکثر شک ایسے ہوتے ہیں جن کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی۔ شیخ چلی کے منصوبوں کی طرح سمجھے؟" میں ہونقوں کی طرح فراز کا منہ تکتا رہا۔

"خیر چھوڑو یہ مورتی تم اپنے میوزیم میں رکھ لینا، میری طرف سے حقیر سا تحفہ سمجھ کر۔"

فراز نے میرے حیرت زدہ چہرے پر اپنی شرارت بھری نظریں جمائے ہوئے کہا۔

"تحفہ سمجھ کر رکھ لوں؟" میں مزید حیران ہوتے ہوئے بڑبڑایا۔

"ہاں... ہاں میرا یہی مطلب ہے۔"

"مگر تم مجھے اتنا قیمتی تحفہ..."

"بھئی تم دوست بھی تو اتنے قیمتی ہو .... قیمتی دوست قیمتی تحفہ۔" فراز نے شوخ لہجے میں کہا۔

"مگر"

"بھئی یہ اگر مگر کیا لگا رکھی ہے تم نے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہیں حیرانگی کا مرض لاحق ہو گیا ہے، کسی اچھے ڈاکٹر سے علاج کراؤ۔ ورنہ بڑا نقصان ہو سکتا ہے۔"

"شکریہ فراز.... ایسی نادر شے تحفتاً دینے پر میں میوزیم کی انتظامیہ کی جانب سے بھی تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ تمہیں جلد ہی میوزیم کی انتظامیہ کی طرف سے شکریہ کا ایک خط بھی مل جائے گا، لیکن کیا تم یہ بتانا پسند کرو گے کہ تمہارے پاس یہ نادر مورتی آئی کہاں سے؟" میں نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے بے چینی کے ساتھ پوچھا۔

"اس سے قبل کہ میں تمہیں اس مورتی کی تاریخ سنانا شروع کروں، تم سے ایک سوال پوچھنا چاہوں گا۔ تم میرے بچپن کے دوست ہو اگر کوئی تم سے یہ پوچھے کہ کیا فراز کے جسم پر کوئی داغ، تل یا کوئی اور ایسی نشانی موجود ہے جس کے ذریعے تم اُسے پہچان سکو تو تم کیا جواب دو گے؟"

فراز نے اسکول ماسٹر کے انداز میں مجھ سے سوال کیا۔

"تمہارے بائیں بازو پر تتلی کی طرح کا ایک دھبہ ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں اور حارث بچپن میں تمہیں اُس دھبے کے حوالے سے خوب چڑایا کرتے تھے۔"

میں نے اپنی یادداشت کے کباڑخانے میں جھانکتے ہوئے کہا۔

جواب میں فراز نے اپنی قمیض کی بائیں آستین اوپر چڑھا دی۔ اُس کے بازو سے وہ تتلی نما دھبہ غائب تھا۔ میں آنکھیں پھاڑے اُس کے بازو کو تکتا رہا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

فراز نے مجھے پریشان دیکھا تو مُسکراتے ہوئے اپنے دائیں ہاتھ کی آستین اُوپر چڑھا لی۔ وہ تتلی نما دھبہ اُس کے دائیں بازو پر موجود تھا۔

"اُف میرے خُدایا!" میں نے اپنا سر تھام لیا۔ اسی لمحے مجھے لگا جیسے فراز ہَوا کے دوش پر اُڑتا ہُوا مجھ سے دُور ہوتا جا رہا ہے۔ دُور بہت دور۔ یہاں تک کہ مجھ سے دو فٹ کے فاصلے پر بیٹھا ہوا فراز مجھے پاسپورٹ سائز کے فوٹو کی طرح نظر آنے لگا۔ اس کے بعد میری آنکھوں کے بلب فیوز ہو گئے۔

"او کمزور دل کے آدمی اُٹھ!" فراز مجھے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھول کر خود پر گھٹنوں کے بل جھکے ہوئے فراز کے چہرے پر نظریں جمانے کی کوشش کی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ابھی ابھی کسی طویل نیند سے بیدار ہوا ہوں۔ اصل میں بات یہ تھی کہ میں فراز کی اُلجھی الجھی اور حیرت انگیز باتیں سُنتے سُنتے بے ہوش ہو گیا تھا۔

"معاف کرنا یار! مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اتنے ڈرپوک نکلو گے۔ مطمئن رہو میں جیتا جاگتا فراز ہوں۔ کوئی بھوت پریت نہیں۔" فراز نے مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر کہا۔

"تمہارے بائیں بازو کا دھبہ تمہارے دائیں بازو پر کیسے آیا؟" میں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں فراز سے سوال

کیا۔ اِس سوال کے جواب میں فراز نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ لیا۔ فراز کا دل دائیں جانب دھڑک رہا تھا۔

میرے ذہن میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ مجھے لگا جیسے میں پھر بے ہوش ہو جاؤں گا۔ یکا یک میرے ذہن میں حارث کی بولنگ کا واقعہ چھنا کے کے ساتھ روشن ہوا..... حارث کی بائیں ہاتھ کی بولنگ، مہاتما بدھ کی مورتی میں دائیں ہاتھ کا خم اور فراز کے دائیں ہاتھ پر موجود دھبّہ اور دائیں جانب دھڑکتا ہوا دل.....

"یہ سب کیا ہے۔ کیا یہ سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں؟" میں نے سوچا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال پیدا ہوا۔ یہ سب آئینے میں نظر آنے والے عکس تو نہیں؟ جیتے جاگتے گوشت پوست کے ٹھوس عکس۔ لیکن یہ عکس کیسے ہو سکتے ہیں؟ بدھ کی مورتی کی میں نے خود اچھی طرح جانچ کی تھی۔ فراز میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور حارث کو میں نے ہی نہیں ساری دنیا نے بولنگ کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ سب سو فیصد اصلی تھے۔ زندہ تھے۔

"ذرا اٹھو!" میں نے فراز کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

"کیوں کیا ہُوا؟" فراز پریشان ہوتے ہوئے بولا۔

"ذرا آئینے کے سامنے آؤ!" میں نے اُسے لائبریری کے کونے میں آویزاں آئینے کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔

"کیوں کیا آئینے کو شرمندہ کرنا چاہتے ہو؟"

"ارے آؤ تو" میں فراز کو دھکیلتا ہوا آئینے کے سامنے لے گیا اور مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ آئینے میں نظر آنے والے فراز کا عکس مجھے اپنے برابر میں کھڑے ہوئے فراز سے زیادہ اصلی لگا۔ گویا میرے برابر میں کھڑا ہوا فراز اصلی فراز نہ تھا بلکہ اصلی فراز کا گوشت پوست پر مشتمل عکس تھا۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ پہلے والا فراز کہاں ہے؟ میرے ذہن میں نئے نئے سوالات سر اُٹھانے لگے۔

"تم کیا سوچ رہے ہو؟ میں کوئی اور ہوں جو فراز کا عکس بن کر آیا ہوں۔" فراز نے یا اُس عجیب و غریب شخص نے میرے دِل کی بات کو بھانپتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔

میں نے کچھ کہنا چاہا مگر صرف تھوک نگل کر رہ گیا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں فراز ہی ہوں۔ بس یہ ہے کہ میں اپنے ہی عکس میں بدل چکا ہوں۔" فراز نے آئینے میں نظر آنے والے عکس کو غور سے دیکھتے ہوئے لمبا سانس کھینچ کر کہا۔

"مگر کیسے؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

میرے سوال کے جواب میں فراز نے جو کہانی سُنائی وہ اُسی کے الفاظ میں کچھ یُوں ہے۔

خراجِ تحسین

محمد امان خان دل

اشعار میں خراجِ عقیدت حسین شاہ
تجھ سے ہے یہ ثبوتِ محبّت حسین شاہ

روشن کیا جہان میں تُو نے وطن کا نام
تجھ سے ہمارے مُلک کا اُونچا ہُوا مقام

کانسی کا تُو نے مُلک کو تمغہ دلا دیا!
دنیا میں اپنی قوم کا رتبہ بڑھا دیا!

اتنا بھی کر دیا تو غنیمت ہے دوستو
یہ بھی حسین شاہ کی ہمّت ہے دوستو

اس بار اگر وہ سول میں جاتا نہیں غریب
تمغہ ہمیں تو ایک بھی ہوتا نہیں نصیب

کتنے ہی دیس خواہشِ نصرت لیے ہوئے
واپس گئے ہیں جیت کی حسرت لیے ہوئے

تُو نے حسین شاہ رکھی لاج دیس کی
عزّت بڑھی ہے تجھ سے بڑی آج دیس کی

یارب حسین شاہ کی دنیا سنوار دے
شایانِ شان تو اُسے عزّ و وقار دے

دِل کی بھی ہے دُعا وہ بڑا آدمی بنے
دنیائے باکسنگ کا محمّد علی بنے

پاکستان بھر میں آنکھ مچولی کے نیوز ایجنٹ

علم وادب کے فروغ میں جو ادارے "آنکھ مچولی" سے تعاون کر رہے ہیں، ان کی تعداد بے شمار ہے
اس صفحے پر ہم صرف اُن بڑے ایجنٹس کی فہرست دے رہے ہیں، جن کی کوششوں سے ماہنامہ
آنکھ مچولی پاکستان کے دُور دراز علاقوں تک بڑی تعداد میں پہنچتا ہے۔

محمد حسین برادرز - کراچی	فون:- ۷۲۳۹۵۵
سلطان نیوز ایجنسی - لاہور	فون:- ۵۸۲۴۹
ملک تاج محمد صاحب - راولپنڈی	فون:- ۵۵۴۳۲۱ / ۸۴۷۹۸۶
مہران نیوز ایجنسی - حیدر آباد	فون:- ۲۰۱۲۸
افضل نیوز ایجنسی - چوک یادگار - پشاور	فون:- ۶۲۵۱۵ / ۶۲۷۵۱
اے ایس حامد نیوز پیپر ٹریڈرس - ملتان	فون:- ۴۳۳۱۰ / ۴۱۷۵۷
فیاض بک ڈپو - فیصل آباد	فون:- ۲۷۴۰۶
ایم ایم ٹریڈرز - کوئٹہ	فون:- ۷۵۰۰۲
ملک اینڈ سنز - سیالکوٹ	فون:- ۸۷۹۸۹

سعید بک اسٹال - گجرات	فون:- ۰۴۳۳۱
پاکستان اسٹینڈرڈ بک اسٹال - سرگودھا	فون:- ۶۲۹۵۱
کیپٹل نیوز ایجنسی - بہاولپور	فون:- ۲۹۵۷
طاہر نیوز ایجنسی - جہلم	فون:- ۰۵۹۴۱
چوہدری امانت علی اینڈ سنز - رحیم یار خان	فون:- ۲۶۲۶
وہاڑی نیوز ایجنسی - ریل بازار - وہاڑی	
اسلم نیوز ایجنسی - اخبار گھر - گوجرانوالہ	
اشرف نیوز ایجنسی - بالمقابل جی ٹی ایس بس اسٹینڈ - اوکاڑہ	
نیا مکتبہ اردو - جی ٹی روڈ - سرائے عالمگیر	

سلمان برادرز - نوابشاہ فون:- ۲۴۱۴

رسالہ نہ پہنچنے کی صورت میں یا بروقت نہ ملنے پر مندرجہ ذیل پتے پر خط لکھیے!

سرکولیشن مینجر - ماہنامہ "آنکھ مچولی" ڈی - ۱۱۲ - نورس روڈ - سائٹ - کراچی ۱۶

بچّوں کے قومی انتخاب

طاہر مسعود

ایک دلچسپ انتخابی معرکہ جس میں ملک بھر کے بچّے شریک ہو رہے ہیں۔

جب بھی ملک میں انتخابات ہوتے ہیں، بچّے اِن انتخابات میں اپنی کم عمری کی وجہ سے حصّہ نہیں لے پاتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے ملک کے بچّے تو ماشاءاللہ بے حد ذہین اور سمجھ دار ہیں وہ خوب فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کون سے امیدوار اچھے ہیں اور کون سے بُرے۔ کون حکومت چلانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور کون اس صلاحیت سے محروم ہے۔ آنکھ مچولی نے بچوں کی اس صلاحیت کو آزمانے کے لیے اپنے طور پر انتخابات منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان انتخابات میں صرف بچّے ہی ووٹ ڈال سکتے ہیں۔ ان صفحات پر بچّوں کے حلقۂ انتخاب سے جو امیدوار حصّہ لے رہے ہیں، اُن کے نام، تفصیلی تعارف اور منشور شائع کیا جا رہا ہے۔ بچّے ان امیدواروں کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے بعد بیلٹ پیپر پر اپنے پسندیدہ امیدوار کے نام کے سامنے کراس (x) کا نشان لگا دیں اور اسے لفافے میں بند کر کے قریبی بیلٹ بکس / لیٹر بکس / میں ڈال دیں۔ ادارہ آنکھ مچولی نے اس مقصد کے لیے ایک خصوصی الیکشن سیل قائم کر دیا ہے۔ جب تمام بیلٹ پیپرز الیکشن سیل میں پہنچ جائیں گے تو یہاں ووٹوں کی گنتی ہوگی۔ جس کے بعد ——— الیکشن کمشنر سب سے زیادہ ووٹ حاصل کرنے والے امیدوار کی کامیابی کا اعلان اگلے شمارے میں کر دے گا۔

نوٹ :۔ انتخابات کے متعلق جتنی اصطلاحات عام طور پر استعمال کی جاتی ہیں، ان کے معنی بھی لکھ دیے گئے ہیں تاکہ بچوں کو آئندہ ملکی انتخابات میں حصہ لینے میں دشواری نہ ہو۔ بھاری اکثریت سے کامیاب ہونے والے امیدوار کے لیے سفارش کی جائے گی کہ وہ بچوں کی نمائندگی کے لیے بڑوں کی اسمبلی تک جائیں۔

امیدواروں کی اہلیت :۔ بچوں کے انتخابات کے لیے ہنگامی طور پر قائم کردہ انتخابی سیل کے امیدواروں کو اہلیت کے لیے مندرجہ ذیل اوصاف کو لازمی قرار دیا گیا۔

_____ ضروری ہے کہ امیدوار بچوں میں مقبول ہو۔

_____ ضروری ہے کہ امیدوار صرف بچوں کے مسائل کی بات کرے۔

_____ امیدوار کا پاکستانی شہریت رکھنا ضروری ہے۔

_____ ضروری ہے کہ امیدوار پاکستان اور پاکستانی بچوں سے بے پناہ محبت کرتا ہو۔

بچوں کے حلقۂ انتخاب کے امیدواران۔

ان انتخابات میں حصہ لینے کے لیے چھ امیدواروں نے اپنے اپنے کاغذات نامزدگی داخل کیے۔ جن میں سے ملکی ماؤس اور ٹارزن کے کاغذاتِ نامزدگی رٹرننگ آفیسر نے مسترد کر دیے۔ کیونکہ دونوں امیدوار غیر ملکی تھے۔ اس طرح مقابلے پر صرف چار امیدوار باقی رہ گئے جنھیں رٹرننگ آفیسر نے ان کی فرمائش کے مطابق انتخابی نشانات الاٹ کر دیے ۔۔۔ پولنگ کے لیے آخری تاریخ ۲۰ دسمبر مقرر کی گئی ہے۔ اس کے بعد ڈالے جانے والے ووٹ شمار نہیں کیے جائیں گے۔ انتخابات میں حصہ لینے والے امیدواروں کے نام یہ ہیں۔

۱۔ جیدی ۲۔ انکل سرگم ۳۔ ماسی مصیبتے ۴۔ ڈوڈو

ان امیدواروں کا انتخابی نشان اور منشور دیکھنے سے پہلے آپ چند بنیادی باتیں ذہن نشین کر لیجیے۔

الف :۔ انتخابات میں اکثر امیدوار جیتنے کے لیے نہایت دلکش مگر جھوٹے وعدے کرتے ہیں۔ صرف منشور پڑھ کر ان کو ووٹ دینے کا فیصلہ ہرگز نہ کیجیے۔ یہ بھی دیکھیے کہ کیا وہ اپنے وعدے پورے کر سکتے ہیں یا اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لیے آپ کو ورغلا رہے ہیں۔

ب :۔ امیدواروں کے وعدوں کو تعمیری اور فائدہ مند ہونا چاہیے۔ ایسے وعدے جن سے نئی نسل اور ملک و قوم کو نقصان پہنچتا ہو، ان امیدواروں کو بالکل منتخب نہ کیجیے۔

ج :۔ امیدواروں کے ماضی اور ان کے کردار کو پرکھیے اور دیکھیے کہ کیا یہ واقعی آپ کی نمائندگی کے مستحق ہیں۔ اس سلسلے میں اپنے دوستوں سے مشورے کیجیے اور جس امیدوار کو آپ صحیح سمجھتے ہوں اس کی حمایت میں کام بھی کیجیے اور اسے کامیاب کرانے کی ہر ممکن کوشش کیجیے۔

ان چند ضروری باتوں کے بعد امیدواروں کی زبانی ان کا انتخابی تعارف اور منشور ملاحظہ ہو۔

انتخابی نشان:۔ کدو

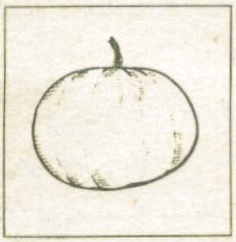

امیدوار:۔ جیدی

امیدوار کی انتخابی تقریر:۔

آپ تو مجھے جانتے ہی ہیں میں جیدی ہوں YOU KNOW میں بچّوں کا بے حد فیورٹ کیریکٹر ہوں ۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں ہنالولو گیا ہوا تھا ۔ وہاں مس پنکی میری دوست تھیں ۔ انہوں نے مجھ سے کہا "مسٹر جیدی! آپ الیکشن کیوں نہیں لڑتے ۔ آپ کی پاپولرٹی تو عوام میں بے حد ہے ۔ میرا مطلب ہے شہرت ۔

میں نے کہا "مس پنکی! آئی ایم اے بیوٹی فل جنٹلمین ۔ میں لڑنا بھڑنا پسند نہیں کرتا۔"

مس پنکی بولیں ۔ "لیکن میں تو الیکشن لڑنے کو کہہ رہی ہوں۔"

میں نے جواب دیا ۔ "او ہاں الیکشن ۔۔۔ میں نے کئی بار الیکشن لڑا ہے اور کئی بار الیکشن میں میرا اسپیکشن بھی ہوا ہے ۔

تو پیارے بچو! مس پنکی کے زور دینے پر میں الیکشن میں کھڑا ہوا ہوں ۔ آپ تو مجھے جانتے ہی ہیں ۔ میں ریڈیو اور ٹی وی پر آتا ہوں ۔ سب ٹی وی والے زبردستی کھینچ کرنے جاتے ہیں کہ مسٹر جیدی جب آپ ٹی وی پر نہیں آتے ہیں تو لوگ ٹی وی دیکھنا چھوڑ دیتے ہیں ۔

منشور:۔ سویٹ بچو! میں الیکشن میں جب کھڑا ہونے لگا تو مس پنکی نے کہا مسٹر جیدی! آپ بچّوں کے سامنے اپنا منشور بھی پیش کیجیے گا ۔ ان کے کہنے پر میں نے ، ۲ روپے آٹھ آنے کا منشور بنا کر پیش کیا ۔ اس پر مس پنکی بولیں منشور ہوٹل کا بل نہیں ہوتا ۔ منشور میں وعدے ہوتے ہیں جسے جیتنے کے بعد امیدوار پورے کرتے ہیں ۔ میں وعدہ کرتا ہوں جھوٹ موٹ کا نہیں اصلی وعدہ کہ جیتنے کے بعد میں

- جیدی اینڈ کمپنی کی جانب سے بچّوں میں ھرّھرّ کا مربہ مفت تقسیم کروں گا ۔
- بچّوں کو لے کر دُنیا کی سیر کو نکلوں گا ۔۔۔ پیارے پیارے بچّوں کو برّاعظم انٹارکٹا ، جزیرہ ہوائی ، دریائے جیحوں کے علاوہ پیچوں کی ملیاں اور پڑعیدن بھی لے جاؤں گا ۔

- اکثر پاپا اور ممی کو شکایت رہتی ہے کہ ان کے بچوں کو انگریزی نہیں آتی۔ میں بچوں کو انگریزی سکھانے کے لیے ایک انگلش اسپیکنگ کورس شروع کر دوں گا، مس پنکی اس کورس کی انچارج ہوں گی۔ (ویسے مس پنکی نے انگریزی مجھ ہی سے سیکھی ہے)
- الیکشن جیتنے کے بعد میں تمام اسکولوں کا طوفانی دورہ کروں گا اور اپنے اوور کوٹ سے دو درجن خرگوش نکال کر دکھانے کا دلچسپ مظاہرہ پیش کروں گا۔
- میں ہر اسکول میں ایک چڑیا گھر قائم کراؤں گا۔ اور بچوں کی خاطر ہر چڑیا گھر میں اود بلاؤ، نیل کنٹھ، زیبرا، اور زراف وغیرہ کے ساتھ ایک ایک دن گزاروں گا۔
- ٹیلی وژن اسٹیشن کو بچوں کی ملکیت میں دے دوں گا تاکہ وہ جب اور جیسا پروگرام چاہیں پیش کریں۔
- بچوں سے ملاقاتوں میں انہیں سچ بولنے، بڑوں کا ادب کرنے، اُستادوں کا کہا ماننے اور لکھنے پڑھنے میں دل لگانے کے مشورے دوں گا۔

محلّے کے تمام بچوں کو جمع کر کے ان کی قلمی دوستی کرواؤں گا۔

امیدوار :- انکل سرگم

انتخابی نشان :- گدھا

انتخابی تقریر :- دوستو! ٹیلی وژن پر آپ نے مجھے دیکھا ہوگا۔ کتنے مزے مزے کی میں باتیں کرتا ہوں۔ اور بات ہی بات میں پتے کی بات کہہ جاتا ہوں۔ میرے مقابلے میں جتنے امیدوار ہیں سب مسخرے ہیں۔ میں بھی مسخرا ہوں مگر ذہین مسخرا ہوں۔ آپ کے مسائل حل کرانے کے لیے بھی ذہانت کی ضرورت ہے۔ اگر آپ نے مجھے کامیاب کرایا پھر آپ کے عیش ہوں گے۔

منشور :- میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ جیتنے کے بعد میں بچوں کے لیے درج ذیل خدمات انجام دوں گا۔

- اسکول سارا سال بند رہیں گے صرف گرمیوں کی تعطیلات میں کھلیں گے۔

- بچّوں کو اسکول میں ہوم ورک نہیں دیا جائے گا۔
- ہر روز اسکول کی طرف سے بچّوں کو آئس کریم کھلائی جائے گی۔
- اسکول کی مسوں اور ٹیچروں کو ہدایت کی جائے گی کہ وہ آئندہ بچّوں کی پٹائی نہیں کریں گے، بلکہ اُنھیں ڈانٹ بھی نہیں سکیں گے۔
- بچّے چاہیں گے تو سارا دن وی سی آر اور رات گئے تک ٹی وی دیکھ سکیں گے۔
- والدین سے کہا جائے گا کہ آئندہ وہ گھر کے تمام معاملات کے فیصلے بچّوں کے مشورے سے کیا کریں۔
- بچّے اسکول سے گھر واپسی پر پارکوں اور باغوں میں سیر و تفریح کرتے جا سکتے ہیں۔ اسی لیے انھیں کسی سے اجازت لینے کی بھی ضرورت نہیں۔
- اُستاد کے کلاس روم میں داخل ہونے پر بچّے احتراماً کھڑے نہیں ہوا کریں گے۔
- بچّوں پر یہ پابندی نہیں ہوگی کہ وہ ہمیشہ سچ ہی بولیں، موقع محل دیکھ کر وہ بہانہ بھی کر سکتے ہیں اور جھوٹ بھی بول سکتے ہیں۔
- ٹی وی پر بچّوں کا محبوب پروگرام "کلیاں" دوبارہ شروع کر دیا جائے گا۔
- ہر گلی میں کرکٹ کی پچ بنوائی جائے گی تاکہ بچّے آرام سے کھیل سکیں۔

امیدوار :- ماسی مصیبتے۔

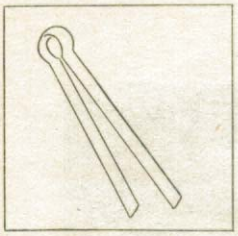

انتخابی نشان :- (چمٹا)

انتخابی تقریر :- میری آنکھ کے تارو، دل کے ٹکڑو، راج دلارو، میں ماسی مصیبتے ہوں۔ یعنی تمہاری ماسی ہوں اور تمہارے لیے ہر مصیبت جھیلنے کو تیار ہوں۔ میرے دشمن کہتے ہیں بچّیوں کو ہانڈی چولھا کرنا چاہیئے۔ میں کہتی ہوں میں اپنے مخالف امیدواروں کے سامنے کی ہانڈی کو بیچ چوراہے پر پھوڑوں گی۔ ذرا جیت

تو تُوں ... ہائے ہائے میرے جگر گوشوں کے کیسے کیسے مسئلے ہیں، چُن چُن کر اُنہیں حل کروں گی ۔ جو کچھ کروں گی منشور میں لکھ دیا ہے ۔ پڑھ لو اور مجھے ووٹ دو ۔

منشور :- ● صبح سویرے دیکھتی ہوں بچّے بھاری بھاری کتابیں بستے میں بھر کر ہانپتے کانپتے اسکول بھاگے جارہے ہیں ۔ میں اُن کے بستے کا بوجھ ہلکا کراؤں گی ۔ اتنی ہی کتابیں پڑھواؤں گی جسے وہ آسانی سے اُٹھا سکیں گے ۔

● اسکولوں کے باہر ریڑھی لگاؤں گی اور بچّوں کو مفت کھلاؤں گی ۔ گھر والے اُنھیں ٹھیک سے کھلاتے پلاتے ہی نہیں ہیں ، کیسے کمزور کمزور دکھتے ہیں بیچارے ۔

● صحت خراب کیوں نہ ہو، امتحان کے دنوں میں رات کو جاگ جاگ کر پڑھتے جو ہیں ۔ ہر امتحان سے پہلے پرچہ آؤٹ کر دوں گی تاکہ آسانی سے امتحان کی تیاری کرلیں، کامیاب ہوں اور ماسی مصیبتے کا نام روشن کریں ۔

● ان بچّوں کو گھر سے کتنے کم پیسے ملتے ہیں .... ہے ہے میرے بچّو فکر نہ کرو میں تمہاری جیب خرچ بڑھوادوں گی .... ابّا کی آدھی تنخواہ تمہیں ہی ملا کرے گی ۔ مجھے ووٹ دینا نہ بھُولنا ۔

● ارے تم لوگ بس اسٹاپوں پر کیوں سوکھتے ہو ۔ ٹرامیں چلواؤں گی ، ٹرامیں ۔ مزے سے بیٹھ کر آنا ، جانا ، جانا اور آنا ....

● محلّے میں ہر اتوار گولے گنڈے مُفت ملیں گے .... ایسے عیش کہاں ہوں گے ۔

● آپ کے امّی ابّو سے سفارش کروں گی کہ وہ اُن سے باہر کے کام نہ کروایا کریں ۔

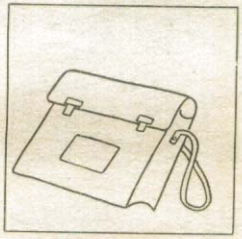

انتخابی نشان :- بستہ ۔ امیدوار :- ڈو ڈو

انتخابی تقریر :- آپ نے مجھے ٹی وی پر دیکھا ہوگا ۔ آنکھ مچولی مارچ ۸۷ء کے شمارے میں میرا انٹرویو بھی پڑھا ہوگا ۔ میں وہی ڈوڈو ہوں میرا اصل نام آدرش ہے ، آپ کا سچّا دوست اور ہمدرد ۔ میں لمبے چوڑے وعدے

نہیں کرتا۔ آپ نے یقیناً دوسرے امیدواروں کا بھی منشور دیکھا ہوگا۔ میں آپ سے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ ووٹ ایک مقدس امانت ہے۔ یہ امانت اُسی کے حوالے کیجیے جو اس کی حفاظت کر سکے۔ آپ کا امیدوار آپ کے شایانِ شان ہونا چاہیے۔ ایک ایسا امیدوار جس کے متعلق آپ سب کو بتا سکیں کہ یہ میرے ووٹوں سے منتخب ہوئے ہیں۔

منشور :- میں یہ وعدہ تو نہیں کرتا کہ آپ کے سارے مسائل حل کرا دوں گا لیکن میری کوشش ہوگی کہ وہ کام انجام دوں جو آپ کو فائدہ پہنچا سکے، ایک اچھا طالب علم، ایک اچھا شہری بنا سکے۔ میری کوشش ہوگی کہ۔

- ہر محلے میں بچوں کی ایک لائبریری قائم کی جائے جس میں دلچسپ معلوماتی کتابیں اور رسالے ہوں تاکہ ان کے مطالعے سے بچوں کے علم میں اضافہ ہو۔
- ایسے سرکاری اسکول جہاں بچوں کے بیٹھنے کے لیے بینچیں اور ڈیسک تک نہیں ہیں وہاں یہ ضروری سہولتیں مہیا کی جائیں گی۔

سارے اسکولوں کا میڈیم ایک کر دیا جائے گا اِن میں تعلیم اور دیگر سہولتوں کا معیار بھی ایک جیسا مقرر کیا جائے گا۔ یہ نہیں ہوگا کہ اعلیٰ اسکولوں میں غریبوں کے بچے نہیں پڑھ سکتے۔

- اسکولوں میں داخلہ صرف ذہانت اور قابلیت کی بُنیاد پر دیا جائے گا۔
- اسکولوں میں ایسے اساتذہ رکھے جائیں گے جن کو علم اور بچوں سے محبت ہو۔
- اسکولوں میں بچوں سے چندہ نہیں لیا جائے گا اور اسکولوں پر پابندی لگا دی جائے گی کہ وہ بچوں سے کسی چیز کی فرمائش نہ کیا کریں۔
- اسکولوں میں مباحثے، مشاعرے، ڈرامے، ٹیبلو اور کھیلوں کے مختلف مقابلے ہوں گے۔ ہر اسکول میں بچوں کے مقابلے ہوں گے، پھر یہ مقابلے علاقے کے اسکولوں کی بنیاد پر پھر شہر کے اسکولوں کی بُنیاد پر پھر ملک گیر بنیاد پر ہوں گے اور جو بچہ ان سب میں کامیابی حاصل کر کے اوّل آئے گا اُسے ایم اے یا ایم ایس سی تک کی تعلیم کا وظیفہ دیا جائے گا۔
- وہ بچے جو سڑکوں پر پھول بیچتے، گاڑیاں صاف کرتے یا گیراجوں میں کام کرتے ہیں اُنہیں "قوم کی امانت" قرار دیا جائے گا۔ اور اُن کی تعلیم کا سرکاری بندوبست کیا جائے گا۔
- جو والدین اپنی اولاد کی طرف سے غفلت برتتے ہیں اُنہیں پابند کیا جائے گا کہ وہ کچھ وقت روزانہ اپنے بچوں کو دیا کریں۔
- بڑوں کی اسمبلی میں پہنچ کر میں بچوں کے مسائل کی آواز اُٹھاؤں گا اور بڑے بڑوں کے چھکے چھڑا دوں گا۔

انتخابی اصطلاحات

ووٹ ایک طبع شدہ کاغذ پر امیدوار کے لیے شہری کی رائے کا نام ووٹ ہے۔

الیکشن کمیشن ایک ادارہ جو انتخابات کی تیاری اور نگرانی کے فرائض انجام دیتا ہے۔

حلقہ بندی پورے ملک کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے حلقہ بندی کی جاتی ہے۔

ریٹرننگ افسر ایک ضلع میں کئی ریٹرننگ افسر ضلع کے بڑے افسر کو جوابدہ ہوتے ہیں۔

پریذائیڈنگ افسر پولنگ بوتھ کا افسرِ اعلیٰ۔

ووٹر شہری جس کی عمر کم از کم ۲۱ سال ہو اور جس کا شناختی کارڈ بن چکا ہو (لیکن یہاں یہ غیر ضروری ہیں)

ووٹر لسٹ سرکاری سطح پر مرتب کی جانے والی فہرست جس میں ووٹر کے نام کا اندراج ہوتا ہے۔

امیدوار انتخابی نشست کے لیے ووٹوں کا طلب گار۔

کاغذاتِ نامزدگی چھپے ہوئے فارم پر امیدوار کے کوائف جنہیں انتخاب سے قبل متعلقہ الیکشن آفس میں جمع کروانا ضروری ہوتا ہے۔

منشور امیدوار کا اپنے عوام کے لیے پروگرام کہ وہ جیتنے کے بعد کیا کرے گا۔

انتخابی نشان امیدواروں کو الیکشن کمیشن کی جانب سے جاری کیے گئے مختلف نشانات۔ تاکہ اَن پڑھ لوگ بھی نشان دیکھ کر رائے دے سکیں۔

بیلٹ گلی کوچوں میں آویزاں کیے جانے والا پرچا۔ جس پر امیدوار کا نام، انتخابی نشان بنا ہوتا ہے۔

یا ووٹ طلب کرنے کی اپیل جلی حروف میں لکھی ہوتی ہے۔

الیکشن آفس انتخابی امیدوار کا ووٹر سے رابطے کے لیے دفتر۔

بیلٹ پیپر ایسا کاغذ جس پر امیدواروں کے نام اور مختلف انتخابی نشان چھپے ہوتے ہیں۔ رائے دہندہ اس پر اپنی رائے دیتا ہے۔

بیلٹ بکس لکڑی کا ڈبہ جس میں بیلٹ پیپر (ووٹ) ڈالے جاتے ہیں۔

پولنگ بوتھ ووٹ ڈالنے کی جگہ۔

بیلٹ پیپر برائے رائے دہندگان

نمبر شمار	نام امیدوار	انتخابی نشان	رائے کے اظہار کا خانہ
۱	جیدی	کدّو	
۲	ڈو ڈو	بستہ	
۳	ماسی مصیبتے	چمٹا	
۴	انکل سرگم	گدھا	

☆ آپ جس امیدوار کو بھی ووٹ دینا چاہیں اُس کے نام کے سامنے دیے ہوئے خالی خانے میں × کا نشان لگا دیجیے۔

☆ اپنا ووٹ لازماً ۱۶ر دسمبر ۸۸ء تک بیلٹ بکس یعنی لیٹر بکس میں ڈال دیں۔

بچوں کے قومی انتخابات کے سلسلے میں ووٹرز کا ضابطۂ اخلاق

۱۔ باکردار، تعلیم یافتہ اور قومی سوچ رکھنے والے لوگوں کی حمایت کیجیے۔

۲۔ انتخابی مہم کے دوران اپنے مخالفین پر تنقید کرتے ہوئے تحریر و تقریر میں شائستہ زبان استعمال کیجیے۔ تاکہ آپ مہذّب سمجھے جائیں۔

۳۔ ذات پات، علاقہ، اور فرقے کے بجائے اپنے منشور کی بنیاد پر انتخابی مہم چلائیے۔

۴۔ جعلی ووٹنگ کے ذریعے اپنے اور اپنے امیدوار کی بدنامی کا سامان مہیّا نہ کیجیے۔

۵۔ انتخابی نتائج کو کھلے دل سے تسلیم کر کے اپنے جمہوریت پسند مہذّب اور بالغ نظر ہونے کا ثبوت دیجیے۔

۶۔ محلّوں اور گلی کوچوں میں زوردار آوازیں لاؤڈ اسپیکر نہ بجائیے۔ آپ کا یہ عمل بیماروں اور طالب علموں کے لیے تکلیف دہ ہو سکتا ہے۔

۷۔ دیواروں پر نعرے لکھ کر انہیں گندا نہ کیجیے۔ صفائی اچھی قوموں کی پہچان ہے۔

۸۔ جلسے، جلوس گلی کوچوں اور شاہراہوں کے بجائے پارکوں اور میدانوں میں منعقد کیجیے۔ تاکہ ٹریفک کا نظام معطّل نہ ہو۔

۹۔ رات گئے گلی کوچوں میں نعرے بازی اور شور شرابہ کر کے عوام کے آرام میں خلل نہ ڈالیے۔

۱۰۔ پولنگ کے دوران اور اُس کے بعد امن و امان قائم رکھنے میں مدد دیجیے۔

موت کی وادی میں

سید خورشید عالم

وہ سو میل لمبے سفر پر روانہ ہوا لیکن ایک غلطی تباہ کن ثابت ہوئی۔

۳۱ر سالہ رابن پیچ کیلی فورنیا کا ایک انتہائی ماہر اسکائیر ہے۔ اسے برف پر پھسلنے اور چھلانگیں لگانے میں کبھی خوف محسوس نہیں ہُوا۔ اُسے برف اور ماحول کی خاموشی بڑا سکون دیتی تھی۔ اپریل ۱۹۸۶ء میں اس نے ایک بار طویل فاصلے کے لیے اسکیٹنگ کا منصوبہ بنایا۔ یہ فاصلہ سو میلوں پر محیط تھا اور اس میں دس دن لگنے تھے۔ اس نے اپنے لیے ہلکی غذاؤں کے ڈبّے، فرسٹ ایڈ کا سامان، پھاوڑے، رسّی، نقشے، اسٹوو، پکانے کا تیل اور سونے کے لیے سلیپنگ بیگ تیار کیا۔ اس سارے سامان کا وزن بمشکل ۷۰ر پونڈ بنتا تھا۔

۲۲۔اپریل کی صبح اُس نے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ کئی گھنٹوں کے سفر کے بعد اس نے ایک مقام پر دوسرے راستے کا انتخاب کیا۔ تاکہ اس شارٹ کٹ کے ذریعے وہ اپنی منزل پر جلد پہنچ سکے۔ یہ راستہ قدرے نشیبی تھا۔ اس نے اپنی دونوں اسٹیکس برف میں گاڑ کر انہیں جھٹکا دیا اور آگے تیزی سے پھسلنے لگا۔ اچانک اُسے اپنی غلطی کا احساس ہُوا۔ اُسے اس تیزی سے نہیں پھسلنا چاہیے تھا اُس نے اپنے آپ کو روکنا چاہا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ اس نے جلدی سے کندھے سے لٹکے ہوئے سامان کے تھیلے کو اُتار پھینکا۔ مگر پھر بھی اُس کی رفتار کم نہ ہوئی۔ اس کا توازن بگڑ چکا تھا۔ آگے ڈھلان ختم ہو رہی تھی اور .... پھر آخری لمحوں میں رابن نے اپنے آپ کو قلابازی کھاتے ہوئے نیچے کی جانب آتا ہُوا محسوس کیا۔

تھوڑی دیر تک اُس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ وہ بالکل خالی الذہن ہو کر نیلے آسمان کی وسعتوں کو دیکھتا رہا۔ پھر حواس کچھ بحال ہونے لگے۔ اس نے دیکھا کہ وہ برف کے ایک تودے میں دھنسا ہُوا ہے۔ اُسے اپنی پیٹھ اور بائیں ٹخنے میں سخت درد کا احساس بھی ہونے لگا۔ اس نے اپنی بائیں ٹانگ کو حرکت دینا چاہی تو اس کی کراہ نکل گئی۔

"میرے خدا! میری ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی اب میں اس جگہ سے کیسے نکل سکوں گا" ایک لمحے کے لیے وہ پریشان ہو گیا۔ مگر پھر اس نے بہت جلد اپنے اعصاب پر قابو پا لیا۔ اس نے سوچا کہ اس موقعے پر صرف ہمت اور برداشت ہی سے زندگی بچ سکتی ہے۔ ورنہ اس ویرانے میں کوئی اس کی آواز بھی نہ سن سکے گا۔ آہستہ آہستہ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ بارہ سال سے زیادہ عرصے تک اسکائنگ کے دوران اُسے معمولی سی خراش بھی نہیں آئی تھی۔ مگر آج وہ ایک حادثے کا شکار ہو کر زندگی اور موت کے دوراہے پر کھڑا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس کا تھیلا سو فٹ دُور پڑا ہے۔ اس نے نرم نرم برف پر گھسٹ کر اپنے سامان تک پہنچنا چاہا۔ مگر ٹانگ کے درد نے اُسے رُک جانے پر مجبور کر دیا۔ رابن نے ایک بار پھر اپنی تمام توانائیوں کو جمع کر کے نہایت احتیاط سے اپنے سامان کی طرف گھسٹنا شروع کیا۔ سامان کے قریب ہی اُسے پھاوڑا اور ایک اسٹک بھی پڑی ہوئی نظر آئی۔ سامان کے قریب پہنچ کر وہ ایک بار پھر برف پر چت لیٹ گیا اور اپنی کھوئی ہوئی توانائی جمع کرنے لگا۔ اپنے تجربے اور اُس علاقے سے ناواقفیت کی بنا پر اُسے اتنا یقین تھا کہ وہ آبادی سے میلوں دُور ہے۔ وہ پھر اُٹھ بیٹھا اور سامان کھولنے لگا۔ سامان کھول کر اُس نے اپنے لیے دلیہ تیار کیا اور مزے لے لے کر کھانے لگا۔ شدید بھوک نے تھوڑی دیر کے لیے اس کی تکلیف بھی دُور کر دی تھی۔ کھانے کے بعد اُس نے اپنے پھاوڑے کی مدد سے برف میں اتنا سوراخ کر لیا جس میں وہ آرام سے سما جائے۔ پھر اُس نے اپنے جوتے اُتارے اور سلیپنگ بیگ میں گھس کر اس سوراخ میں

اُتر گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں رابن نیند کی وادیوں میں اُتر چکا تھا۔

اگلی صبح بیدار ہو کر اُس نے اپنا نقشہ دیکھا۔ اُسے اندازہ ہو گیا کہ جنوب مغرب کی سمت دس میل دُور ہوپ ویلی میں گلین آلن نامی ایک کیمپ موجود ہے۔ جہاں اُسے امداد مل سکتی ہے۔ مگر اتنا فاصلہ ٹوٹی ہوئی ٹانگ سے طے تو نہیں ہو سکتا۔ ایک بار پھر اُس نے اپنے حوصلے کو جمع کیا۔ اس کے پاس بارہ دن کی خوراک موجود تھی۔ اس نے سوچا۔

"میں کم از کم بارہ دن تو زندہ رہ سکتا ہوں۔ اس دوران اگر اپنے سفر کو جاری رکھوں تو شاید میری زندگی بچ جائے۔"

اُسے اچانک ایک خیال آیا۔ اس نے اپنے دونوں اسکیمز کو رسّی سے جوڑ کر باندھا۔ پھر اپنے سامان کے تھیلے کو اس پر رکھ کر دھکا دیا۔ سامان آہستہ آہستہ آگے پھسلنے لگا "واہ! یہ تو عمدہ سی سلیج بن گئی" رابن نے سوچا "اب میں زیادہ آسانی کے ساتھ ہوپ ویلی پہنچ سکوں گا۔"

اس نے چاروں طرف کا جائزہ لیا تو اُسے اندازہ ہوا کہ اُس نے جس راستے کو شارٹ کٹ سمجھ کر اپنے سفر کا آغاز کیا وہ انتہائی خطرناک ہے جہاں چاروں طرف گہری ڈھلانیں موجود ہیں۔ آہستہ آہستہ اُس نے اپنے سلیج کو آگے بڑھانا شروع کیا۔ ایک جگہ اس نے ایک درخت کے نیچے جھکی ہوئی ایک شاخ توڑ کر اپنے ٹخنے پر باندھ لی۔ اب پھر اس کا سفر جاری ہو چکا تھا۔

رابن کا سفر جاری رہا۔ شروع کے تین دن وہ اپنے آپ سے باتیں کرتا رہا۔ کبھی گنگنانے لگتا۔ کبھی خاموشی اس کے بلند قہقہوں سے گونجنے لگتی۔ اُسے ایسا لگتا کہ ہوا میں اُڑتے ہوئے پرندے، آسمان پر اُڑتے ہوئے بادل اور چاروں طرف بکھری ہوئی برف اس کی ہر بات سمجھ رہی ہے۔ چوتھے دن اُسے اپنے دوست احباب یاد آنے لگے۔ رابن کو ایسا لگتا جیسے وہ سب اس کا انتظار کر رہے ہوں۔ ان سب کے چہرے اس کی نگاہوں میں گھومنے لگے۔۔ پانچواں دن رابن کے لیے انتہائی سخت ثابت ہُوا۔ اس دن موسم انتہائی خراب تھا اور طوفان کی آمد کے آثار تھے۔ دوپہر کو رابن اپنے لنچ سے جیسے ہی فارغ ہُوا طوفان نے اپنا رنگ جمانا شروع کر دیا۔ اس نے جلدی جلدی برف میں چھوٹا سا گڑھا بنایا اور کسی نہ کسی طرح اس میں گھس کر بیٹھ گیا۔ برف روئی کے گالوں کی طرح گرتی رہی۔ ہر چیز برف میں چھپتی جا رہی تھی۔ رابن کو برفباری ہمیشہ اچھی لگتی تھی مگر اس دن اُسے جیسے برفباری سے نفرت ہونے لگی۔ اگلے دن برفباری رکی تو رابن کا چھوٹا سا گڑھا بڑے گڑھے میں بدل چکا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے چاروں طرف سے برف ہٹا کر اپنے لیے راستہ بنایا۔ اس کے ٹخنے کی تکلیف پھر بڑھنے لگی تھی۔ اس دن وہ بمشکل دو فرلانگ کا فاصلہ طے کر پایا ہو گا۔ سخت سردی سے اس کے جسم کی کھال پھٹنے لگی تھی۔

رابن کو اپنے چاروں طرف بکھری ہوئی سفید برف سے خوف آنے لگا تھا۔ اسے برف میں عجیب و غریب شکلیں نظر آنے لگتیں جو اُسے ڈرانے کی کوشش کرتی تھیں۔ ساتویں دن اس کے اعصاب میں شکستگی کے آثار نمودار ہونے لگے۔ اُسے لگتا کہ جیسے وہ ساری زندگی اسی طرح برف میں گھسٹتا رہے گا۔ مگر انسانوں کی دنیا میں نہیں پہنچ سکے گا۔ اس کو اپنے سارے دوست احباب اور ان کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات ایک ایک کرکے یاد آنے لگے۔

"وہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ مگر کسی کو یہ نہیں معلوم کہ میں کس مصیبت میں گرفتار ہوں" اس نے سوچا۔

اُسے اپنے آپ پر غصّہ آنے لگا کہ کیوں اس نے دوسرے راستے کا انتخاب کیا۔ مگر اب غصّہ بے کار تھا۔

آٹھویں دن اس نے اپنی ہمتوں کو پھر یکجا کیا اور اپنے اندازے کے مطابق چار فرلانگ سے زیادہ کا سفر طے کر لیا۔ مگر نویں دن اس کی ہمت ایک بار پھر ٹوٹ گئی۔ اُسے شدید بخار ہو گیا تھا اور ٹخنے کی تکلیف نے ایک مستقل کیفیت کا روپ دھار لیا تھا۔ اس پر غشی کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ بالآخر وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔ وہ کب تک بے ہوش پڑا رہا اسے کچھ بھی نہیں معلوم۔ اگلا دن اس کے سفر کا دسواں دن تھا جب اُسے ہوش آیا نیلے آسمان کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک سی لوٹ آئی۔ اُسی لمحے اس نے برف پر کسی کے پھسلنے کی آواز سُنی۔ اُس نے گردن گھما کر دیکھا۔ اس کے دائیں جانب ایک شخص آرام سے اسکائینگ کرتا ہُوا جا رہا تھا۔ رابن کی رگوں میں خُون کی گردش ایک دم تیز ہو گئی۔ وہ اُٹھ بیٹھا اور اپنی ساری توانائی جمع کرکے زور سے چلّایا۔

"ہیلو .... ہیلو...." ماحول رابن کی آواز سے گونج اُٹھا۔ اس شخص نے اس کی آواز نہیں سُنی۔ رابن کی آنکھ سے آنسو موتیوں کی طرح ٹپکنے لگے۔ اُس نے ایک بار پھر اس رحمت کے فرشتے کو آواز دی۔

"رُک جاؤ .... میں یہاں ہوں .... میری بات سُنو .... خدا کے لیے ...." اچانک وہ شخص رُک گیا۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ اُسے برف پر پڑا ہوا ایک خستہ حال شخص نظر آیا۔

یہ اسکائیر ۲۲ سالہ جان اسٹائمنز تھا۔ جان سانتا کروز کے اسٹیٹ پارک کا لائف گارڈ تھا۔ پھر وہ تیزی سے رابن کی طرف آیا۔

"تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟" اُس نے سوال کیا۔

"میں رابن ہوں۔ دس دن سے یہاں بھٹک رہا ہوں۔ میری بائیں ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے" رابن بولا۔ جان اس کے پاس بیٹھ گیا اور رابن کی ٹانگ کا معائنہ کیا۔ اس کی ٹانگ بُری طرح سوج چکی تھی۔ پھر وہ کھڑا ہُوا اور بولا۔

"تم یہیں ٹھہرو۔ قریب ہی ایک کیمپ ہے جہاں سے میں رینجرز ہیڈ کوارٹر فون کرکے تمہارے لیے مدد

طلب کرتا ہوں ۔ جب تک تم یہیں رہو۔"

کیمپ پہنچ کر جان نے جب رینجرز ہیڈ کوارٹرز فون کیا تو پتا چلا کہ وہاں ہیلی کاپٹر خراب ہے اور اس کی مرمّت ہو رہی ہے ۔ وہ لوگ ایک کرائے کا ہیلی کاپٹر بھیجنے پر تیار ہو گئے ۔

چند گھنٹوں کے بعد رابن نے فضا میں ہیلی کاپٹر کی آواز سُنی اُس نے جلدی سے اپنی سُرخ جیکٹ اُتار کر ہوا میں لہرانا شروع کر دیا ۔

"میں یہاں ہوں .... میں یہاں ہوں .... اس طرف ...." مگر ہیلی کاپٹر آگے نکلتا چلا گیا ۔ تھوڑی دیر بعد ہیلی کاپٹر دوبارہ نمودار ہُوا ۔ اب کے وہ نیچی پرواز کر رہا تھا ۔ رابن نے پھر اپنی جیکٹ لہرانا شروع کر دی ۔ پائلٹ اور رابن کی نظریں ایک دوسرے سے ٹکرائیں ۔ پائلٹ نے اُسے دیکھ کر سر ہلایا اور چند گز کے فاصلے پر اُترنے لگا ۔ ہیلی کاپٹر کے اُترنے کے بعد اس میں سے دو آدمی ایک اسٹریچر لے کر اُترے اور تیزی سے رابن کی طرف لپکے ۔

اگلے دن جب رابن کی آنکھ کھلی تو وہ اسپتال میں تھا ۔ اس کی بائیں ٹانگ پر پلاسٹر چڑھا ہُوا تھا ۔ اچانک دروازہ کھُلا اور ڈاکٹر کے ساتھ جان اندر داخل ہوا ۔ اُس نے نہایت گرم جوشی سے جان سے ہاتھ ملایا ۔

"تمہارا بہت بہت شکریہ دوست" رابن نے کہا ۔

"یہ میرا فرض تھا" جان بولا ۔ "اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو کب کا ہمت ہار بیٹھتا اور موت کے منہ میں چلا جاتا ۔ مگر تم نے بڑی ہمت کا ثبوت دیا" جان نے کہا ۔

رابن کی نگاہوں میں سارے واقعات گھوم گئے ۔ اس نے نہایت آہستگی سے کہا ۔

"یہ میری زندگی کا سب سے یادگار تجربہ تھا" پھر وہ زور سے قہقہہ مار کر ہنسنے لگا ۔ (ماخوذ)

۱۰۴ صفحات پر مشتمل

راہنما

سچّی قرآنی کہانیوں کا خوبصورت مجموعہ

قرآن کی یہ سچّی کہانیاں بچّوں کی تربیت میں نہایت اہم کردار ادا کر سکتی ہیں

اس کے حصول کے لیے ۱۰ روپے کا منی آرڈر یا ڈاک ٹکٹ ارسال کر دیجیے

نسیم ابدالی

سائنس انکوائری

حیاتین یا وٹامنز

حیاتین یا وٹامنز وہ کیمیائی اجزا ہیں جو نشوونما کے لیے انتہائی ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ حیاتین یا وٹامنز ۱۹۱۲ء میں دریافت کئے گئے اور ان کو انگریزی کے حروف تہجی کے مطابق نام دیا گیا۔ قدیم زمانے سے ہی انسان کو اتنا ضرور پتا تھا کہ کچھ غذائی اجزا ایسے ہیں جو جسم میں پیدا ہونے والی خرابیوں کو دور کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ۱۶۰۱ء میں لوگ یہ بات بہت اچھی طرح جانتے تھے کہ لیموں کا عرق فسادِ خون کو روکنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اس کے علاوہ جسم پر پڑنے والے سیاہ داغوں کو بھی لیموں کا عرق دور کر سکتا ہے۔ ۱۷۹۵ء میں ملاحوں کی خوراک میں لیموں کو خاص طور پر شامل کیا جاتا تھا تاکہ تازہ سبزیوں کی کمی کی وجہ سے پیدا ہونے والی اس بیماری کو روکا جاسکے لیموں میں ایسکوربک ایسڈ یا وٹامن سی پایا جاتا ہے۔ یہ سبز رنگ کی سبزیوں میں بھی موجود ہوتا ہے۔ وٹامن اے جو دودھ، مکھن، انڈا، ٹماٹر، گاجر اور کاڈ مچھلی کے تیل میں پایا جاتا ہے جسم کی نشوونما میں نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ وٹامن ڈی ہڈیوں کی نشوونما کرتا ہے۔ یہ بھی کاڈ مچھلی کے تیل میں موجود ہوتا ہے اس کے علاوہ مکھن اور دودھ میں بھی پایا جاتا ہے۔ سورج کی روشنی بھی وٹامن ڈی کے حصول کا اہم ذریعہ ہے یہ ہمارے کھال کی خوبصورتی میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔

انڈے، گردے، اناج میں وٹامن بی موجود ہوتا ہے۔ گندم اور کاڈ مچھلی کے تیل میں وٹامن ای پایا جاتا ہے۔

خون۔۔۔خون۔۔۔خون

انسانی جسم میں ایک اہم جز خون ہے۔ جو جسم کے اندرونی اعضا کو آکسیجن جذب کر کے پہنچاتا ہے۔ ایک عام صحت مند انسان کے جسم میں ۴½۵ لیٹر خون ہوتا ہے جو مسلسل گردش کرتا رہتا ہے۔ خون پلازمہ سے جو زردی مائل مائع

ہوتا ہے ۔ کے علاوہ خون کے سُرخ اور سفید جیسے سے مل کر بنتا ہے ۔ خون کے سُرخ جسیموں میں ہیمو گلوبن پایا جاتا ہے جو آکسیجن جذب کر کے دل اور اندرونی اعضا تک پہنچاتا ہے جبکہ سفید جیسے ہمارے جسم کے اندر "پولیس" کا کام سرانجام دیتے ہیں ۔ یعنی یہ جسم کو بیماریوں سے بچاتے ہیں ۔ خون کے سفید جیسے انتہائی کم ہوتے ہیں ۔ یعنی پانچ سو سرخ جسیموں کے ساتھ خون کا ایک سفید جسیمہ ہوتا ہے ۔ سائنس دانوں نے خون کو چار گروپوں میں تقسیم کیا ہے ۔ یعنی اے ۔ بی ۔ اے بی اور او گروپ ۔ اب میڈیکل سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ ضرورت پڑنے پر کسی شخص کو دوسرے شخص کا خون بھی دیا جا سکتا ہے بشرطیکہ دونوں کے خون کا گروپ مل جائے ۔

پنیر کیسے بنتا ہے ؟

پنیر ایک اہم غذا کے طور پر ساڑھے تین ہزار برس سے استعمال ہو رہا ہے ۔ اس سے چربی اور دودھ سے بنایا جاتا ہے ۔ سب سے پہلے لیکٹک ایسڈ اور جمے ہوئے دودھ کو عام دودھ میں شامل کر دیا جاتا ہے ۔ پھر اس میں سے پانی نکال لیا جاتا ہے ۔ یہ اپنے ذائقے اور غذائیت کے اعتبار سے نہایت مفید خوراک ہے ۔ خصوصاً سرد ممالک میں یہ زیادہ استعمال ہوتا ہے ۔

زہر کیا ہے ؟

کوئی بھی ایسی چیز جو ہمارے جسم میں داخل ہو کر جسم کا نظام بگاڑ دے یا اس نظام کو روک دے اُسے زہر کہتے ہیں ۔ کچھ کیمیائی اجزا بھی بطور زہر استعمال ہوتے ہیں ۔ مثال کے طور پر پروسک ایسڈ اور سٹرائی چن یا کچلہ وغیرہ زہر ہیں ۔ ان کی خفیف مقدار بھی کسی انسان کو موت کی نیند سُلانے کے لیے کافی ہے ۔ اس کے علاوہ کچھ دوائیں بھی ایسی ہوتی ہیں جو مقررہ مقدار سے زائد استعمال کر لی جائیں تو زندگی کو شدید خطرات لاحق ہو سکتے ہیں ۔ حتیٰ کہ اگر گوشت اور مچھلی کو تازہ استعمال کرنے کے بجائے گلا سڑا ہونے کی صورت میں استعمال کیا جائے تو یہ بھی زہریلا ہو سکتا ہے ۔ ان چیزوں کے زہریلے ہونے کی وجہ وہ جراثیم ہوتے ہیں جو ان میں پیدا ہو کر ان کے اثرات کو تبدیل کر دیتے ہیں ۔

اسٹیم انجن کس نے بنایا ؟

یوں تو بھاپ کے انجن کے نظریے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بہت سے لوگوں نے کام کیا مگر اس انجن کی تیاری کا سہرا ایک انگریز تھامس سیوری کو جاتا ہے ۔ اس نے ۱۶۹۸ء میں اس انجن کو تیار کیا ۔ اس انجن کو ابتدا میں پانی کھینچنے کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ۔ پھر تھامس نیوکمن نے ۱۷۱۰ء میں ایک قدرے بہتر انجن بنایا مگر دونوں انجنوں سے توانائی زیادہ خارج ہو کر ضائع ہو جاتی تھی ۔ ۱۷۶۹ء میں جیمز واٹ نے ایک انجن تیار کیا جو ان دونوں انجنوں سے زیادہ بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرتا تھا ۔ اس کے بعد صنعت و ذرائع نقل و حمل میں اسٹیم انجن کا استعمال بڑھنے لگا اور آج صنعتی ترقی اپنے عروج پر نظر آتی ہے ۔

بوتل کا فوّارہ

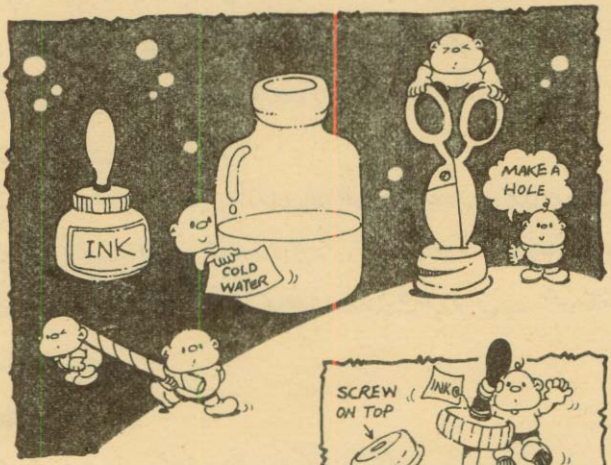

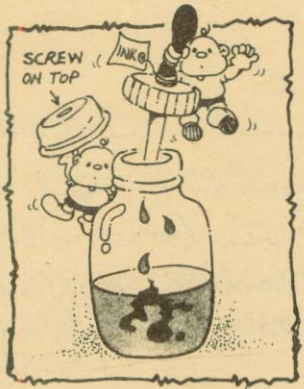

آپ نے پارک میں لگے ہوئے خوبصورت فوّارے
دیکھے ہوں گے۔ آج ہم آپ کو ایسا ہی ایک فوّارہ بنانا
سکھائیں گے جو آپ گھر میں بڑی آسانی سے بنا سکیں
گے۔اس کے لیے آپ کو جن چیزوں کی ضرورت پڑے

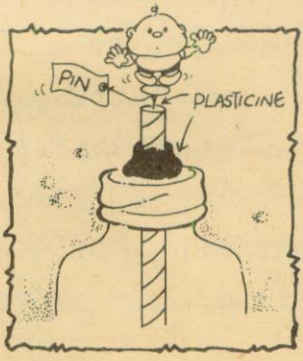

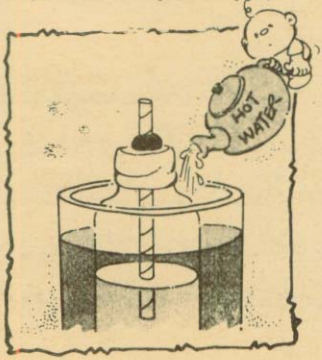

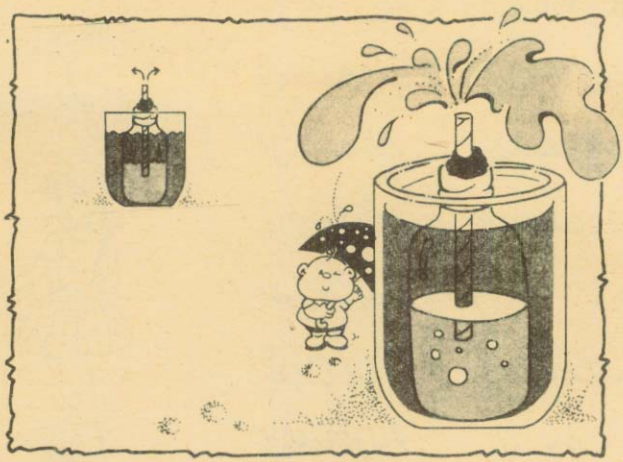

گی وہ یہ ہیں۔ ایک چھوٹی بوتل جس پر ڈھکن لگا ہُوا ہو۔ اسٹرا، گوند یا ٹیپ۔ ایک پن۔ کسی بھی رنگ کی روشنائی۔ قینچی اور ایک بڑی بالٹی۔ جس میں گرم پانی موجود ہو۔

سب سے پہلے آپ بوتل میں اتنا ٹھنڈا پانی ڈالیں کہ بوتل بالکل بھر نہ پائے۔ بلکہ کچھ خالی رہے۔ اب اس کے ڈھکن میں قینچی کی مدد سے سوراخ کر لیجیے۔ اب بوتل کے پانی میں سُرخ، سبز یا نیلی روشنائی کے چند قطرے ٹپکا دیجیے۔ تاکہ پانی رنگین ہو جائے۔ اب ڈھکن کو مضبوطی سے بند کر دیجیے۔ اور اس پر اسٹرا لگا کر اسے بھی بند کر دیجیے۔ اسٹرا کے منہ پر بھی گوند لگا کر بند کرنے کے بعد اس میں پن کے ذریعے بہت باریک سا سوراخ بنا لیجیے۔

اب اس بوتل کو ایک بڑی بالٹی میں رکھ کر اس میں کھولتا ہوا گرم پانی انڈیلیے۔ ذرا خیال رکھیے! کہیں گرم پانی کے چھینٹے آپ کے ہاتھ یا پیر پر نہ پڑیں ورنہ کھیل ہی کھیل میں معاملہ خراب ہو جائے گا۔ گرم پانی ڈالنے کے بعد چند لمحوں کے انتظار کے بعد آپ ایک حیرت انگیز منظر دیکھیں گے۔ بوتل میں موجود رنگین پانی ایک باریک فوارے کی شکل میں خارج ہونے لگے گا۔

کیا آپ جانتے ہیں ایسا کیوں ہُوا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ گرم پانی نے بوتل کے اندر کی ہَوا کو گرم کر دیا۔ جس سے گرم ہَوا نے باہر نکلنا چاہا۔ جس سے پانی اُوپر کی طرف نکاسی کے راستے سے نکلنے لگا۔ تو آپ نے دیکھا! کہ گھر بیٹھے ایک خوبصورت فوارہ کس طرح بنایا جا سکتا ہے۔

بچّوں کے لیے ایک نظم

شین فاروقی

بچّوں کا مُسکرانا — تاروں کا جھلملانا
ہر چیز سے حسیں ہے — اِن کی جو ہاں نہیں ہے
دِل کے بڑے شکاری — یہ پیار کے پجاری
یہ دھوپ میں شجر ہیں — صحرا میں اک نہر ہیں
آنکھوں کا نُور ہیں یہ — دل کا سرور ہیں یہ
ننھے چراغ ہیں یہ! — خوشیوں کے باغ ہیں یہ
چاہیں یہ نانیوں کو — یعنی کہ سانیوں کو
جو گھر ہو اِن سے خالی — لگتا ہے جیلی جیلی
اِن کے بغیر دھرتی — ہو خاک کی اِمرتی
جنّت حسیں جگہ ہے — کہنا مگر مرا ہے
بچّوں بغیر جنّت — ہو گی سرائے وحشت
دنیا میں اِن کی آمد — کہتی ہے یہ قسم سے

ربِّ جہاں مکمّل
ناخوش نہیں ہے ہم سے

وہ کراچی کی ایک مشہور تفریح گاہ تھی جہاں بچّے،
بوڑھے، جوان، اور خواتین سب ہی تفریح کی غرض سے
آیا کرتے تھے۔ خاص طور پر بچے تو بڑی تعداد میں وہاں
آتے تھے اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس تفریح گاہ میں
پھولوں کے سرسبز باغات کے علاوہ بے شمار ایسے
پنجرے تھے جن میں بھالو، مور، مچھلیاں اور نہ جانے کون
کون سے بے شمار خوبصورت جانور قید تھے۔ جن کو دیکھنے
کے لئے بچے بڑی دُور دُور سے آتے تھے اور پھر

بندر کا غرور

غرور انسان کرے یا بندر، سزا مل کر ہی رہتی ہے۔

سیما عروج صدّیقی

اِن جانوروں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔
انہی بے شمار جانوروں میں سے ایک جوڑا ایک
بندر اور بندریا کا تھا جو ایک پنجرے میں رہا کرتے
تھے یہ دونوں خاصے خوبصورت اور صحت مند تھے۔
جو بچّے اور بڑے ان کے پنجرے کے قریب انہیں دیکھنے
کھڑے ہوتے یہ دونوں پنجرے میں اُچھل کود شروع
کر دیتے اور اپنے ننھے مُنّے ہاتھوں سے تالیاں بجا بجا
کر خوشی کا اِظہار کرتے ان کی حرکات دیکھ کر بچّے بھی
خوش ہوتے اور پھر بچّے بڑے سبھی انہیں مونگ
پھلی، کھجور اور چلغوزے کھانے کے لئے دیتے اور
دونوں بندر بندریا خوب مزے لے لے کر کھاتے

اور ہضم کر جاتے دوسرے جانور انہیں یوں کھاتا دیکھ کر حسرت سے دیکھتے۔ کیوں کہ ان کے پنجرے کے قریب تو لوگ صرف تھوڑی ہی دیر رُکا کرتے تھے اور کچھ کھانے کو بھی نہیں دیتے تھے۔ یوں بہت سے جانور ان بندر اور بندریا سے حسد کرنے لگے۔ اِدھر بندر اور بندریا اپنے کرتب دِکھا دکھا کر لوگوں سے خوب چیزیں اڑاتے اور روز بروز خوب موٹے ہوتے گئے۔

آج بھی وہ لوگوں کی دی ہوئی مونگ پھلیاں اُڑا رہے تھے اور لوگ بھی مختلف چیزیں ان کی جانب پھینک رہے تھے اچانک بندر اور بندریا کے پنجرے کے قریب ایک بڑی پنجرے نما گاڑی آکر رُکی۔ بندر اور بندریا تو دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ اب ہمارے چڑیا گھر میں ایک جانور کا اور اضافہ ہونے والا ہے کیوں کہ جب بھی یہ گاڑی آتی تھی کوئی نہ کوئی جانور اپنے ساتھ ضرور لاتی تھی اور پھر اس جانور کو خالی پنجرے میں بند کر کے چلی جاتی تھی یوں دوسرے لوگوں کی طرح بندر اور بندریا بھی گاڑی کی طرف دیکھنے لگے۔ لیکن یہ کیا۔ دو آدمی جو ڈانگری نما وردی میں ملبوس تھے گاڑی سے اُترے اور بندریا کا پنجرہ کھولنے لگے اس کے بعد دونوں نے بندر اور بندریا کو گدی سے پکڑا اور ایک پُرانے پنجرے میں لے جا کر بند کر دیا۔ یہ پنجرہ بندر اور بندریا کے پنجرے کے پیچھے بنا ہوا تھا جہاں لوگ زیادہ نہیں جاتے تھے لوگ تو صرف آگے والے پنجرے میں بندر بندریا کا تماشہ دیکھ کر آگے بڑھ جایا کرتے تھے۔ بندر اور بندریا اس پنجرے میں آکر اُداس ہو گئے۔ پھر وہ دو آدمی گاڑی کی طرف گئے اور دروازہ کھولنے لگے۔ تالا کھولنے کے بعد انہوں نے ایک چھوٹے گوریلے کے بچّے کو باہر نکالا جسے وہاں موجود بچّوں نے کنگ کانگ کہہ کر اپنی خوشی کا اظہار کیا یہ سیاہ رنگ کا لمبے لمبے بالوں والا انسان نما بندر تھا۔ جو بے ہوش تھا اور بہت بھاری اور موٹا تھا۔ بندر اور بندریا حیرت سے لوگوں کو اور کنگ کانگ کو دیکھ رہے تھے بندر اور بندریا کی طرف کسی نے توجہ ہی نہ دی پھر وہ آدمی بھاری بھرکم کنگ کانگ کو بڑی مشکل سے بندروں کے پنجرے میں بند کر کے چلے گئے تھوڑی ہی دیر میں لوگوں کا ہجوم لگ گیا حالانکہ کنگ کانگ ابھی تک بے ہوش پڑا تھا۔ موٹا کنگ کانگ جونہی ہوش میں آیا لوگوں نے اس پر مونگ پھلی اور ایسی ہی مزے دار اشیا کی بوچھاڑ کر دی وہ مزے سے چیزیں کھانے میں مصروف ہو گیا جب اس نے اپنی بھوک لوگوں کی دی ہوئی مزیدار چیزوں سے مٹالی تو وہ اپنے آپ کو پنجرے میں دیکھ کر لال پیلا ہو گیا۔ اور چنگھاڑتا ہوا لوگوں کی طرف بھاگنے کے انداز میں بڑھا لیکن پنجرے کی سلاخوں سے ٹکرا کر گر پڑا۔ لوگوں نے جب کنگ کانگ کے یہ تیور دیکھے تو کچھ تو بھاگ کھڑے ہونے اور کچھ اس کی بے بسی کا مذاق اڑانے لگے۔ آہستہ آہستہ کنگ کانگ نے اپنے آپ کو اس ماحول کا عادی بنا لیا۔ اِدھر بندر اور

بندریا اُداس اپنے پنجرے میں بیٹھے ایک دوسرے کے جوئیں دیکھتے رہتے تنہائی اور بے کاری میں یہی ان کا بہترین مشغلہ تھا۔ اب لوگ ان کے پنجرے کے قریب پھٹکتے بھی نہ تھے۔ سب کنگ کانگ کے پنجرے کے پاس آتے اس سے لُطف اندوز ہوتے اور اسے چیزیں کھلا کر چلتے بنتے۔ اِدھر کنگ کانگ کھا کھا کر موٹا ہوتا رہا اُدھر بندر اور بندریا پہلی طرح کی غذا نہ ملنے پر دن بدن کمزور ہوتے رہے۔

ایک دِن بندریا بولی "بندر میاں آخر اس کنگ کانگ کالے موٹے بندر میں کون سے ایسے لعل لٹک رہے ہیں کہ لوگ اس کے پاس ہی آتے ہیں۔ حالانکہ وہ تو ہماری طرح کرتب بھی نہیں دکھاتا بس ایک کونے میں مُنہ پھُلائے بیٹھا رہتا ہے یا لوگوں کو کھڑا کھڑا گھورتا رہتا ہے اور تو اور کالا بندر خوبصورت بھی نہیں ہے ہماری طرح۔ ہم تو بھُورے بھُورے ہیں لیکن پھر بھی لوگ اُسے ہی دیکھتے ہیں" بندریا جل کر بولی "آخر ایسا کیوں ہے" بندر میاں جو دور بیٹھے بندریا کی بات سُن رہے تھے چھلانگ لگا کر بندریا کے پاس آ گئے۔ اور بولے "ارے بی بندریا تم تو اپنی بات کرتی ہو ذرا سامنے پنجرے میں دیکھو جنگل کا بادشاہ شیر کیسے مُنہ لٹکائے بیٹھا ہے جب اُس کالے بندر کے آگے لوگ جنگل کے شیر کو بھی گھاس نہیں ڈالتے تو بھلا ہمیں کیا دیکھیں گے۔ ہم تو پھر بندر ہیں۔ لیکن بی بندریا ایک بات سچ سچ اپنے دِل کی کہوں"۔ بندریا بولی "کہو" بندر نے کہا۔ "مجھے یُوں لگتا ہے جیسے ہمیں اپنے غرور اور تکبر کی سزا مل رہی ہے۔ جب لوگ ہمیں دیکھنے آتے اور چیزیں کھلاتے تو ہم کیسے دوسرے پنجرے کے بندروں کو دکھا دکھا کر کھاتے اور اپنی قسمت اور خوبصورتی پر غرور کرتے تھے۔ اور دوسرے کمزور بندر ہمیں حسرت سے دیکھا کرتے تھے بی بندریا میرے خیال میں ہمیں ایسا ہرگز نہیں کرنا اور سوچنا چاہیئے تھا اگر لوگ ہمیں کچھ کھانے کو دیتے بھی تھے تو ہمیں چاہیئے تھا کہ سارا خود ہی نہیں کھا جاتے بلکہ اپنے پڑوسی بندروں کو بھی حصّہ دیتے۔ بی بندریا ہم نے بہت بُرا کیا" بندریہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔ بندریا بھی افسوس کرتے ہوئے بولی "ہاں واقعی بندر میاں ہم نے بہت بُرا کیا۔ ہمیں ایک جگہ رہ کر غرور کا تصوّر بھی نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ ہم دوسرے بندروں کو اپنے آپ سے جُدا قرار دیتے تھے۔ کاش ہم نے ایسا نہ سوچا ہوتا۔ آؤ بندر میاں کیوں نہ ہم اللہ میاں سے اپنے غرور اور تکبّر کی معافی مانگیں" بندر میاں کو بی بندریا کی بات اچھی لگی اور پھر دونوں رو رو کر اللہ میاں سے معافی مانگنے لگے کہ "اللہ میاں ہمارے گذرے دِن لوٹا دے اب ہم کبھی غرور نہیں کریں گے" روتے روتے بندر اور بندریا سو گئے صبح آنکھ کھُلی تو کیا دیکھتے ہیں کہ دو آدمی انہیں گدی سے پکڑ کر ان کے پنجرے میں لیجا رہے ہیں جب کہ کالا بندر بے ہوشی کی حالت میں پنجرے میں پڑا ہے جسے انجکشن کے ذریعے بے ہوش کیا گیا تھا۔ پھر اُن لوگوں نے کنگ کانگ کو

اسی گاڑی میں ڈال کر بند کر دیا۔ اور بندروں کو ان کے پہلے والے پنجرے میں بند کر دیا۔ ایک بچّے نے گاڑی چلانے والے آدمی سے پُوچھا "آپ کنگ کانگ کو کہاں لے کر جا رہے ہیں" تو وہ آدمی جو وردی پہنے ہوئے تھا بولا "بیٹا یہ کنگ کانگ دوسرے شہر کے پنجرے میں منتقل کیا جا رہا ہے کیونکہ دوسرے چڑیا گھر میں بھی جانوروں کی ضرورت ہے اِس لئے اسے وہاں پر رکھا جائے گا" یہ کہہ کر گاڑی روانہ ہوگئی اور بندر اور بندریا اپنے پنجرے میں سے کنگ کانگ کو گاڑی میں بے ہوش جاتا ہوا دیکھ کر خوشی سے اُچھلنے لگے اور لوگوں نے ان کی اُچھل کود سے متاثر ہو کر ان کو مونگ پھلی، چلغوزے اور دوسری اشیاء دینا شروع کر دیں۔ لیکن اب بندر اور بندریا اکیلے نہیں کھاتے بلکہ دوسرے پنجروں کے بندروں اور جانوروں کو بھی دیا کرتے اور جو بھی ملتا صبر و شکر سے کھا لیا کرتے۔

خیال رہے

اگر آپ اپنے پسندیدہ ماہنامہ "آنکھ مچولی" میں لکھنا چاہتے ہیں تو ان باتوں کا خیال ضرور رکھیئے۔

- جو بھی تحریر ہمیں ارسال کریں، وہ آپ کی اپنی تخلیق ہو، نقل یا چوری کی، یا پہلے سے شائع شدہ تحریر ناقابلِ اشاعت ہوگی۔
- پینسل سے، مشکل رسم الخط میں اور چھوٹے پُرزوں پر لکھی گئی تحریر بھی ناقابلِ اشاعت ہوگی۔
- تحریر کاغذ کے ایک جانب، ایک سطر چھوڑ کر صاف اور خوشخط لکھیے۔
- آپ ہمیں اچھی اچھی کہانیاں، نظمیں، گیت، مضامین، دلچسپ واقعات، مزاحیہ تحریریں، لطائف، خاکے، اور ناقابلِ فراموش واقعات لکھ کر بھیجیں تاکہ آپ کی تخلیقی صلاحیتوں میں اضافہ ہو اور آپ مستقبل کے بڑے ادیب بن سکیں۔
- آپ کی تحریر کا اندازِ بیان، خیال اور اسلوب بچّوں کی نفسیات کے مطابق ہونا چاہیئے۔
- جن تحریروں میں نیا پن اور دلچسپی ہوگی، وہ ترجیحی بنیادوں پر جلدی شائع کی جائیں گی۔
- کہانی یا مضمون ہمیں بھیجنے سے قبل اس کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، کیونکہ ناقابلِ اشاعت ہونے کی صورت میں کوئی تحریر واپس نہیں کی جاتی۔

(ادارہ)

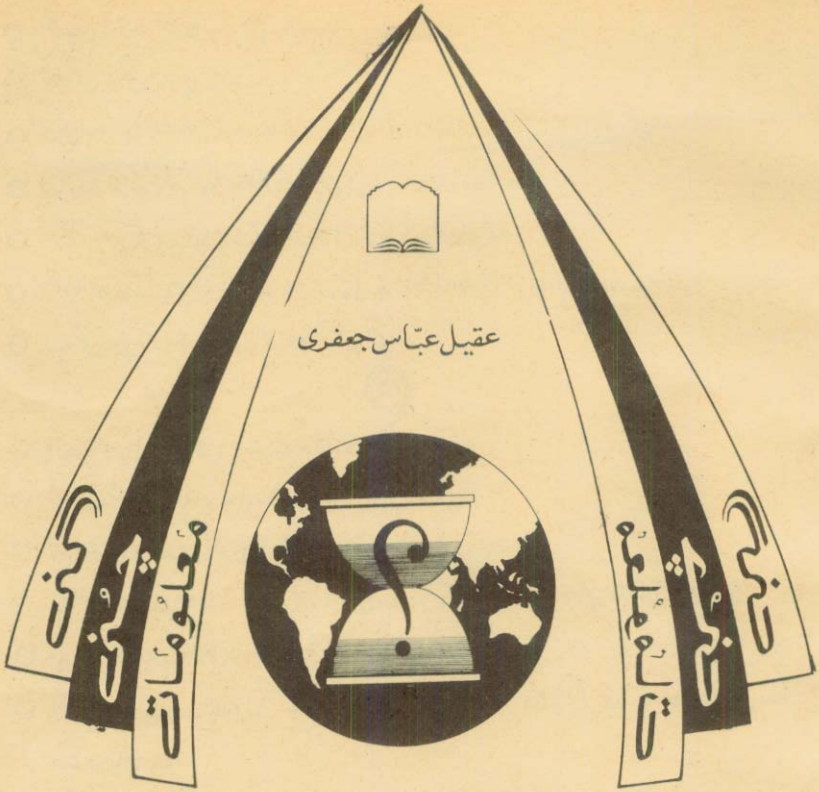

اعداد کا ہمارے زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ دُنیا کی اہم شخصیات ہوں یا بڑے بڑے واقعات، ان سب کا تعلق کسی نہ کسی طرح اعداد سے ضرور بنتا ہے۔ اعداد کے حوالے سے دُنیا بھر کی اہم معلومات پر مبنی یہ سلسلہ ہم ہر ماہ آپ کی دلچسپی اور معلومات میں اضافے کے لیے پیش کرتے ہیں۔ صفر سے شروع ہونے والا یہ سلسلہ دیکھیے کہاں تک جاتا ہے۔

(۳۴)

- سنیل گواسکر نے ٹیسٹ کرکٹ میں ۳۴ سینچریاں بنائی ہیں۔
- دریائے ڈینیوب جو یورپ کے آٹھ ممالک سے گزرتا ہے، دُنیا کا ۳۴ واں بڑا دریا ہے۔
- دنیا کے پہلے خلاباز یوری گگارین کا انتقال مارچ ۱۹۶۸ء میں ایک ہوائی حادثے میں ہُوا۔ اُس وقت اُن کی عمر ۳۴ برس تھی

- انگریزی، دُنیا کے ۳۴ ممالک کی قومی زبان ہے۔
- نظامِ شمسی میں کُل ۳۴ چاند ہیں۔
- امریکی موجد ڈیوڈ بُشنل نے ۱۷۷۶ء میں آبدوز ایجاد کی۔ اس وقت اُس کی عُمر ۳۴ برس تھی۔
- امبرٹو دوم، ۹ مئی تا ۱۴ جون ۱۹۴۶ء تک یعنی کل ۳۴ دن اٹلی کا بادشاہ رہا۔
- سر فرانسس ڈریک نے دُنیا کے گرد پہلا چکر ۳۴ مہینوں میں مکمل کیا تھا۔
- مشہور اسکاٹ سیّاح منگو پارک کو ۱۸۰۶ء میں دریائے نائجر کی دوسری مہم کے دوران وہاں کے مقامی باشندوں نے قتل کر دیا۔ اُس وقت اُن کی عمر ۳۴ سال تھی۔

(۳۵)

- ہاکی کے کھیل میں ۳۵، ۳۵ منٹ کے دو ہاف ہوتے ہیں۔
- فردوسی کی مشہور نظم شاہنامہ ۳۵ سال کے عرصے میں مکمل ہوئی تھی۔
- والٹ ڈزنی نے ۳۵ آسکر ایوارڈ حاصل کیے تھے۔
- براعظم یورپ میں ۳۵ آزاد ممالک ہیں۔ جن میں سے دو ممالک ترکی اور روس کا کچھ حصّہ ایشیا میں بھی ہے۔
- ایک اوسط لمبائی کی پنسل سے ۳۵ میل لمبی لکیر کھینچی جاسکتی ہے۔
- امریکہ کا صدر بننے کے لیے عمر کی کم سے کم حد ۳۵ سال ہے جبکہ پاکستان کا وزیرِاعظم بننے کے لیے بھی عمر کی کم سے کم حد ۳۵ سال ہے۔
- کیپٹن رابرٹ اسکاٹ، رولڈ امینڈسن کے ۳۵ دن بعد قطبِ جنوبی پر پہنچا تھا۔
- ایک چھوٹی لائف بوٹ میں ۳۵ افراد کے بیٹھنے کی گنجائش ہوتی ہے۔
- انیسویں صدی کا مشہور سیّاح اور مہم جو سر رچرڈ برٹن ۳۵ زبانیں بول سکتا تھا۔
- ۱۷۹۱ء میں مشہور موسیقار موزارٹ کا انتقال ہُوا تو اُس کی عُمر صرف ۳۵ برس تھی۔

(۳۶)

- قرآن پاک میں صرف ۳۶ سورتیں ایسی ہیں جو ایک ایک رکوع پر مشتمل ہیں۔
- ابراہم لنکن کے قتل کے وقت امریکہ میں ۳۶ ریاستیں تھیں۔
- سرگار فیلڈ سوبرز اور روی شاستری، دونوں فرسٹ کلاس کرکٹ میں ایک اوور میں چھ چھکے مار کر ۳۶ رنز بنانے کا اعزاز حاصل کر چکے ہیں۔
- شترمُرغ کا انڈا عام مُرغی کے انڈے سے ۳۶ گُنا بڑا ہوتا ہے۔

- کیمیائی عناصر میں سب سے زیادہ آئسوٹوپ، زینون اور سیزیم کے ہوتے ہیں ان دونوں عناصر کے ۳۶، ۳۶ آئسوٹوپ ہوتے ہیں۔
- قائدِاعظمؒ ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ کے رکن بنے۔ اس وقت ان کی عمر ۳۶ برس تھی۔
- ۱۹۷۴ء سے ۱۹۸۵ء تک کلائیو لائیڈ نے بحیثیت کپتان ۳۶ ٹیسٹ میچ جیتے تھے۔
- صحت مند انسانی جسم کا درجہ حرارت ۳۶.۹ درجے سینٹی گریڈ ہوتا ہے۔
- دنیا کا مشہور جریدہ لائف ۲۵ جنوری ۱۹۷۳ء کو بند ہوا یہ جریدہ پہلی بار ۲۳ نومبر ۱۹۳۶ء کو شائع ہوا تھا اور ۳۶ برس جاری رہا تھا۔
- ایڈولف ہٹلر نے اپنی سوانح "مین کیمف" ۳۶ برس کی عمر میں تحریر کی تھی۔

(۳۷)

- قرآنِ پاک کے تیسویں پارے عَمَّ یَتَسَآئَلُوْنَ میں ۳۷ سورتیں ہیں۔
- مائیکل ایچ ہارٹ کی مشہور کتاب "تاریخِ انسانی کے سو سب سے زیادہ بااثر افراد" میں سائنسدانوں اور موجدین کی تعداد ۳۷ ہے۔
- پاکستان میں ملکی توانائی کی ضرورتوں کا ۳۷ فیصد حصہ قدرتی گیس سے پورا کیا جاتا ہے۔
- ایشیا میں ۳۷ چوٹیاں ہیں جن میں سب سے بلند چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ ہے۔
- ۱۱۱، ۲۲۲، ۳۳۳، ۴۴۴، ۵۵۵، ۶۶۶، ۷۷۷، ۸۸۸، ۹۹۹ یہ تمام اعداد ۳۷ سے مکمل طور پر تقسیم ہوتے ہیں۔
- خاندانِ بنوعباس کے خلفا کی تعداد ۳۷ تھی۔
- اٹلی کا مشہور مصور رافیل ۱۴۸۳ء میں گڈ فرائی ڈے کے دن پیدا ہوا اور ۱۵۲۰ء میں گڈ فرائی ڈے کے دن ۳۷ برس کی عمر میں فوت ہوا۔
- جانداروں میں سب سے لمبی ٹانگیں زرافہ کی ہوتی ہیں۔ تاہم اتنی لمبی ٹانگوں کے باوجود اس کی رفتار زیادہ سے زیادہ ۳۷ میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔

(۳۸)

- پاکستان کے قومی ترانے میں ۳۸ ساز استعمال ہوئے ہیں۔
- ۳۸° سینٹی گریڈ، ۱۰۰° فارن ہائیٹ کے برابر ہوتا ہے۔
- کرکٹ کے بلے کی لمبائی ۳۸ انچ ہوتی ہے۔

- دو ممالک کے درمیان دنیا کی سب سے مختصر جنگ ۲۷ اگست ۱۸۹۶ء کو برطانیہ اور زنجبار کے درمیان لڑی گئی۔ یہ جنگ صرف ۳۸ منٹ جاری رہی تھی۔
- نیل آرمسٹرانگ نے جب ۲۱ جولائی ۱۹۶۹ء کو چاند پر پہلا قدم رکھا تو اُس کی عمر ۳۸ سال ۲½ ۱۱ ماہ تھی۔
- ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۴ء کے درمیان چیکو سلواکیہ کے مشہور ایتھلیٹ ایمل زیٹوپیک نے دس ہزار میٹر کی ۳۸ دوڑوں میں حصّہ لیا اور ہر دوڑ میں اوّل آیا۔ اس نے چار اولمپک گولڈ میڈل جیتے اور ۱۸ نئے ریکارڈ قائم کیے۔
- دنیا کے ۳۸ ممالک کے پرچم صرف دو رنگوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں سے ایک ملک پاکستان بھی ہے۔
- روڈولف ڈیزل نے جب ڈیزل انجن ایجاد کیا تو اُس کی عمر ۳۸ برس تھی۔
- دنیا کا پہلا تجارتی ٹیلیگراف رابطہ ۲۴ مئی ۱۸۴۴ء کو امریکہ کے دو شہروں واشنگٹن اور بالٹی مور کے درمیان قائم کیا گیا۔ ان دونوں شہروں کا درمیانی فاصلہ ۳۸ میل ہے۔

(۳۹)

- قرآن پاک کے آخری پارے عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ میں ۳۹ رکوع ہیں۔
- نیویارک میں واقع اقوامِ متحدہ کے صدر دفاتر کی عمارت ۳۹ منزلہ ہے۔
- کیوبا کا مشہور انقلابی رہنما چی گویرا کو جب قتل کیا گیا تو ان کی عمر ۳۹ برس تھی۔
- ۱۷ ستمبر ۱۷۸۷ء کو امریکہ کے آئین پر بارہ ریاستوں کے ۳۹ نمائندوں نے دستخط کیے تھے۔
- مصر کی مشہور ملکہ قلوپطرہ نے ۳۹ برس کی عُمر پائی تھی۔
- رولڈ ایمنڈسن قطب جنوبی پر پہنچنے والا پہلا شخص تھا۔ اُس نے یہ کارنامہ ۳۹ برس کی عمر میں انجام دیا تھا۔
- پارہ جو ایک مائع عنصر ہے، ۳۹ - درجے سینٹی گریڈ پر ٹھوس بن جاتا ہے۔
- امریکہ کا مشہور نیگرو لیڈر مارٹن لوتھر کنگ ۳۹ سال کی عمر میں قاتل کی گولیوں کا نشانہ بنا تھا۔
- امریکہ کا بتیسواں صدر فرینکلن ڈیلانو روزویلٹ ۳۹ برس کی عمر میں پولیو کا شکار ہو کر چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا تھا، مگر بعد میں وہ صحت یاب ہُوا اور چار مرتبہ امریکہ کا صدر منتخب ہُوا۔
- دیوارِ چین کی زیادہ سے زیادہ بلندی ۳۹ فٹ ہے۔

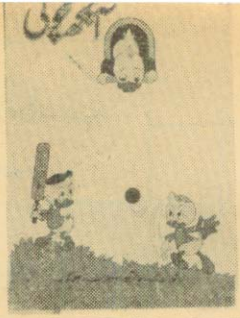

میرا ایک رسالہ ہے

مرسلہ : محمد رضوان

میرا ایک رسالہ ہے — چاند کا جیسے ہالہ ہے
اللہ اور رسولؐ کی بات — کرتے ہیں اس کے صفحات
ہرے بھرے رنگین ورق — دیتے ہیں ہمت کا سبق
کتنے اچھے قصّے ہیں! — شوق سے بچّے پڑھتے ہیں
دلکش اس کی آب و تاب — اکثر دیتا ہے نایاب!
مہر کی کشتی کھیتا ہے — درسِ مروّت دیتا ہے
ہاتھوں میں جب آتا ہے — سب نظروں کو بھاتا ہے
جاتا ہے اُس رستے پر — جس میں عظمت کا زیور
گُن گائے یہ محنت کے — دے پیغام یہ رفعت کے
نیاری نظمیں ہیں اس میں — پیاری نعتیں ہیں اس میں
واقف ہے رنگینی سے — پُر دامن شیرینی سے
لگتا ہے گُل کی صورت — جیسے اک رنگیں مُورت
وہ دیکھو وہ آیا ہے! — نئی بہاریں لایا ہے
رضواں خوش ہو جائیں گے — گھر میں اس کو لائیں گے

روبوٹ کے ہنگامے

ذیشان بن صفدر

ایک روبوٹ کا دلچسپ قصہ جسے امن قائم کرنے کیلئے بنایا گیا تھا

اسکولوں میں گرمی کی چھٹیاں ہو چکی تھیں۔ واصف، ظہران، دانش، سلمیٰ اور آفرین ابھی تک تعطیلات کا کوئی پروگرام طے نہ کر سکے تھے۔ گزشتہ سال تو انھوں نے قریبی گوٹھ میں جا کر ناخواندہ بچوں کو پڑھاتے ہوئے اپنی تعطیلات گزاری تھیں۔ اور اس سے اگلے سال انھوں نے ایک گوٹھ میں صفائی کے پروگرام پر عمل کیا تھا۔

بڑی دیر تک سوچنے کے بعد دانش نے وہ مارا، کا نعرہ لگاتے ہوئے بڑے جوش سے کہا: "سنو واصف، ظہران، سلمیٰ اور آفرین...! بڑا شاندار آئیڈیا آیا ہے۔"

وہ سب جلدی سے دانش کے قریب سرک آئے۔ ظہران نے کہا: "دانش بھائی! آئیڈیا ایسا ہونا چاہیے، جس پر سب کو اتفاق ہو۔"

سلمیٰ اور آفرین ایک ساتھ بولیں: "ظہران بھائی! آپ ہمیشہ گڑبڑ کرتے ہیں، پہلے سے شرط لگا دیتے ہیں۔"

دانش نے سب کے اشتیاق کو دیکھتے ہوئے پہلے کھنکار کر اپنا گلا صاف کیا، پھر بڑی سنجیدگی سے کہا: "میرا خیال

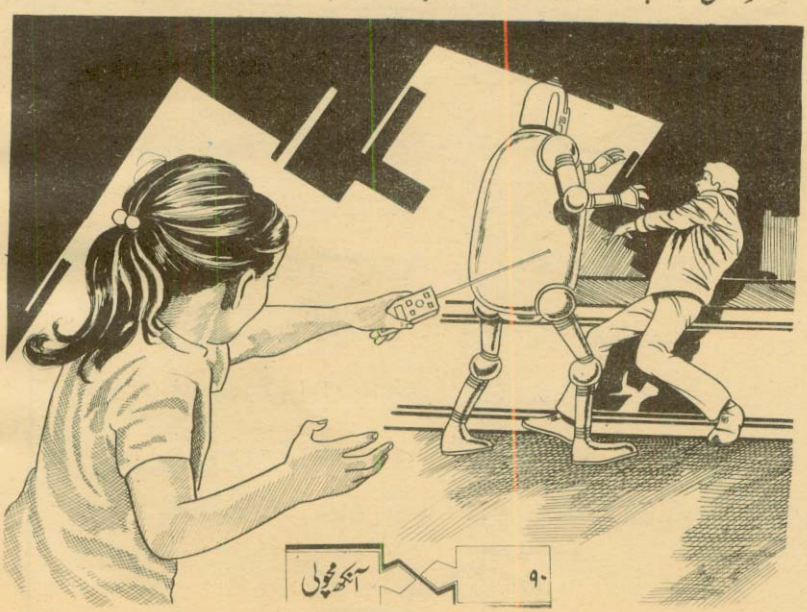

ہے کہ اس سال ایک روبوٹ بنایا جائے۔"

"روبوٹ!" سب نے تقریباً ایک ساتھ حیرت سے پوچھا۔

"ہاں روبوٹ۔" دانش نے اسی سنجیدگی اور متانت سے کہا۔

"ایسے آئیڈیے سے فائدہ جس پر عمل نہ ہو سکے۔" واصف نے کہا۔

"پلیز واصف بھائی۔ ایسا تو نہ کہیے۔ جب دانش بھائی نے روبوٹ بنانے کے متعلق سوچا ہے۔ تو یقیناً انھوں نے اس کی تیاری کے مراحل، لاگت اور دوسری ضروری باتوں کے متعلق بھی سوچا ہوگا۔" آفرین نے اُس کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ بات تو ہے۔" دانش کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ "سلمیٰ! تم آرٹ کی طالبہ ہو۔" قدرے توقف کرتے ہوئے دانش نے کہا۔ "اس لیے روبوٹ کا ماڈل تم ڈیزائن کرو گی۔ واصف اور ظہران! تم دونوں کو انجینئرنگ سے دلچسپی ہے۔ اس لیے روبوٹ کا ڈھانچہ بنانا تمھاری ذمے داری ہوگی۔ جب کہ میں اور آفرین مل کر روبوٹ میں پروگرام فیڈ کریں گے۔ ہم دونوں سائنس کے طالب علم ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ تو ہو گیا، مگر یہ تو معلوم ہو کہ یہ روبوٹ ہوگا کس قسم کا؟" واصف نے پوچھا۔

"جناب! ہم اس سے خدمتِ خلق کا کام لیں گے۔ یہ لڑتے ہوتے لوگوں میں صلح صفائی کرائے گا۔ بچوں، بوڑھوں اور خواتین کو سڑک پار کرائے گا۔ ڈوبتے ہوئے لوگوں کی جان بچائے گا۔ گھر کا سودا سلف لا کر دے گا، وغیرہ۔"

"یہ سب تو خیر ٹھیک ہے۔ مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آئی، آخر روبوٹ بنانے سے ہمیں کیا فائدہ ہوگا۔"؟ سلمیٰ اُلجھن سے بولی۔

"فائدہ۔؟ لو بھلا یہ بھی کوئی سوچنے اور پوچھنے کی بات ہے۔ دوسروں کے کام آکر، دوسروں کے مسائل حل کر کے کیا فائدہ ہوتا ہے۔ ہم گزشتہ دو سال سے تعطیلات میں فلاح و بہبود کے کام کر رہے ہیں۔ گزشتہ برسوں ہم نے ایک گاؤں میں تعلیم اور صفائی کے سلسلے میں کام کیا تھا تو اس سے ہمیں کیا فائدہ ہوا تھا؟" دانش نے اُلٹا سب سے سوال کیا۔

جواب میں آفرین نے کہا۔ "ہمیں ذہنی سکون حاصل ہوا تھا۔ سچی خوشی ملی تھی۔ ہم نے وہ کام اپنے مادی فائدے کے لیے نہیں کیے تھے۔"

"بالکل درست" دانش نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "ہر کام صرف مادی فائدے کے لیے نہیں کیا جاتا۔ بس یہ روبوٹ بھی ہم اپنے سکون اور خوشی کے لیے بنا رہے ہیں۔"

جب روبوٹ بنانے پر اتفاقِ رائے ہو گیا تو سب اپنے اپنے فرائض کی بجاآوری کے لیے ایک دوسرے سے

رخصت ہو گئے۔

سلمیٰ نے شب و روز کی محنت سے چار دن میں روبوٹ کا ڈیزائن تیار کر کے دانش کو پہنچا دیا۔ دانش نے ایک بار پھر اپنے ساتھیوں کو مشورے کے لیے جمع کیا اور جلد ہی یہ محفل برخواست ہو گئی کیوں کہ ڈیزائن میں کسی قسم کی خامی یا کمی نہیں تھی۔ سب نے ہی اُسے اتفاقِ رائے سے منظور کر لیا تھا۔ اور اس ڈیزائن کے مطابق واصف اور ظہران مل کر روبوٹ کا ڈھانچہ بنانے میں مصروف ہو گئے۔ گو ان دونوں کے لیے یہ کام بالکل ہی نیا تھا۔ مگر شوق اور لگن نے ان کے لیے اس کام کو بہت آسان کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دونوں نے وقتِ مقررہ سے پہلے ہی ڈھانچہ تیار کر کے دانش کے سپرد کر دیا۔ انھوں نے یہ کام اس لیے بھی وقت سے پہلے ختم کر لیا تھا کہ اس کے بعد اُنھیں اپنے انکل کے ساتھ نیلم پوائنٹ بھی جانا تھا۔

دانش اور آفرین، دونوں اوّل دن سے ہی کمپیوٹر پروگرامنگ سیٹ تیار کرنے میں لگ گئے تھے۔ ڈھانچہ تیار ہونے تک ان دونوں نے بھی اپنے حصّے کا نصف سے زیادہ کام پورا کر لیا۔ اور ڈھانچے کی تیاری کے بعد تو ان کے کام میں اور تیزی آ گئی۔ پھر جلد ہی انھوں نے بھی اپنا کام مکمل کر کے اُسے ڈھانچے میں فٹ کر دیا۔

جس روز روبوٹ اسمبل ہوا اُس دن سب کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ روبوٹ کا ریموٹ کنٹرول سسٹم آفرین کے ہاتھوں میں تھا۔ اور باقی سب ساتھی تجربے کے لیے روبوٹ کو لیے شہر کے مصروف ترین چوراہے پر پہنچ گئے تھے۔ ظہران نے روبوٹ کے ہاتھ میں پانچ سو کا ایک نوٹ تھما کر سودے کی ایک فہرست اُس میں فیڈ کر دی اور اسے ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور کی طرف روانہ کر دیا۔ روبوٹ خراماں خراماں اسٹور میں داخل ہوا اور اُس نے فہرست کی تمام چیزیں باسکٹ میں ڈالنی شروع کر دیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے اپنا کام ختم کر لیا اور اسٹور کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ سب اُس کی حرکت کو نظر میں رکھے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ روبوٹ نے ضرورت کی تمام اشیا تو اسٹور سے لے لی تھیں مگر ان کی رقم ادا نہیں کی تھی۔ آفرین کی اُنگلیاں ریموٹ پر نہایت بے چینی سے حرکت کرنے لگیں مگر روبوٹ کی کارکردگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بلکہ واپس آتے ہوئے اُسے دو، دو دست سڑک کے کنارے آپس میں بات چیت کرتے نظر آئے۔ روبوٹ نے ان دونوں کے سر ٹکرا دیے۔ کچھ فاصلے پر ایک نابینا سنبھل سنبھل کر اپنی مخصوص سفید چھڑی ٹیکتا چلا جا رہا تھا کہ روبوٹ نے آگے بڑھ کر اُس کی سفید چھڑی چھین لی۔ یہ منظر دیکھ کر سارے ساتھی اور بھی زیادہ گھبرا گئے۔ دانش بار بار ذہن پر زور ڈال کر سوچ رہا تھا کہ آخر روبوٹ کے پروگرامنگ سسٹم میں کہاں خرابی رہ گئی ہے۔ اس روبوٹ کی تخلیق کا مقصد تو رفاہی اور تعمیری تھا۔ جب کہ یہ تو عوام کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو رہا ہے۔ دوسری طرف آفرین ریموٹ کنٹرول کی مدد سے روبوٹ کو راہِ راست پر لانے کی کوشش میں مصروف تھی۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہو چکی تھی۔

اب روبوٹ نے ایک ریسٹورنٹ میں گھس کر اُس کے جلتے ہوئے چولہے بجھانے شروع کر دیے۔ دانش نے

آفرین کے ہاتھ سے ریموٹ لے کر اُسے بمشکل تمام کنٹرول کیا۔ سارے بازار میں ایک ہنگامہ سا مچ گیا۔ بپھرے ہوئے لوگ بڑی مشکل سے اُنھیں معاف کرنے پر آمادہ ہوئے۔

سارے ساتھی روبوٹ سمیت وہاں سے سرپٹ بھاگے۔ گھر پہنچ کر وہ سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ اور روبوٹ کے اندر پیدا ہو جانے والی خرابی پر غور کرنے لگے۔ سب نے بہتیرا سوچا مگر کسی بھی فیصلے پر پہنچنے میں ناکام رہے۔

"یہ خرابی ڈیزائن اور ڈھانچے کی تو ہو نہیں سکتی، جو بھی خرابی ہے، وہ صرف اور صرف کمپیوٹر میں ہے۔ یہ کام دانش اور آفرین کے سوچنے کا ہے۔ کیوں کہ ہمارے گروپ میں یہی دونوں سائنسداں ہیں۔" سلمیٰ نے بہت سوچ سمجھ کر کہا۔

اس کی بات ختم ہوتے ہی ظہران نے کہا: "کیوں نہ ایسا کیا جائے کہ کمپیوٹر سیٹ کی پروگرامنگ کو از سر نو کھول کر فیڈ کیا جائے۔ اس میں اتنا گھبرانے اور پریشان ہونے کی ضرورت تو نہیں۔ یہ ہمارا پہلا تجربہ ہے۔ اتنی بڑی کامیابی کیا کم ہے کہ روبوٹ کام تو کر رہا ہے۔"

ظہران کی بات سُن کر دانش کے چہرے سے فکر و تردّد کے آثار غائب ہو گئے۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ لوٹ آئی۔ وہ شگفتہ لہجے میں سب کو مخاطب کرتے ہوئے بولا: "ساتھیو! میرے خیال میں اس روبوٹ کو یوں ہی رہنے دیا جائے۔ اس کے موجودہ سسٹم میں کوئی تبدیلی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"دانش بھائی! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میرے خیال میں تو اس روبوٹ کو ضائع کر دینا ہی بہتر ہے۔" واصف نے کہا۔

"نہیں یہ منفی سوچ ہے۔" دانش نے کہا: "ہر چیز کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ اگر روبوٹ رفاہی کام نہیں کر رہا تو پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ ہم اس روبوٹ کو شہر میں ہنگامہ کرنے والے شر پسندوں کی سرکوبی کے لیے تو استعمال کر ہی سکتے ہیں۔ جس طرح اس نے نابینا کے ہاتھ سے سفید چھڑی چھین لی تھی، اس طرح یہ شر پسندوں کے ہاتھوں سے آتشیں اسلحہ چھین کر عوام کو ان کی فائرنگ کا نشانہ ہونے سے بچا سکتا ہے۔ جس طرح اس نے دو دوستوں کے سر ٹکرا دیے تھے، اسی طرح شر پسندوں کے سر ٹکرا، ٹکرا کر اُن کے ہوش ٹھکانے لگا سکتا ہے۔ اور جس طرح اس نے ریسٹورنٹ میں گھس کر چولہوں میں جلتی ہوئی آگ بجھا دی تھی۔ شہریوں کے گھروں اور املاک میں شر پسندوں کی لگائی ہوئی آگ بجھا سکتا ہے۔ اس لیے میری درخواست ہے کہ..."

دانش کا جملہ آفرین نے مسکراتے ہوئے پورا کر دیا کہ "روبوٹ کو تباہ نہ کیا جائے اور نہ ہی اس میں کوئی تبدیلی کی جائے۔"

واصف نے نعرہ لگایا: "گڈ آئیڈیا!"

اور اگلے دن بچوں کی اس انوکھی ایجاد کا اخبارات نے شہ سُرخیوں میں اعلان کیا، اور بچوں کے انٹرویو بھی شائع کیے۔ اس بار سب بہت زیادہ خوش تھے کہ انھوں نے اپنی گرمی کی چھٹیوں کو تفریح میں نہیں، تعمیر میں صرف کیا تھا۔

ذہانت ہو تو کوئی کام بھی مشکل نہیں ہوتا

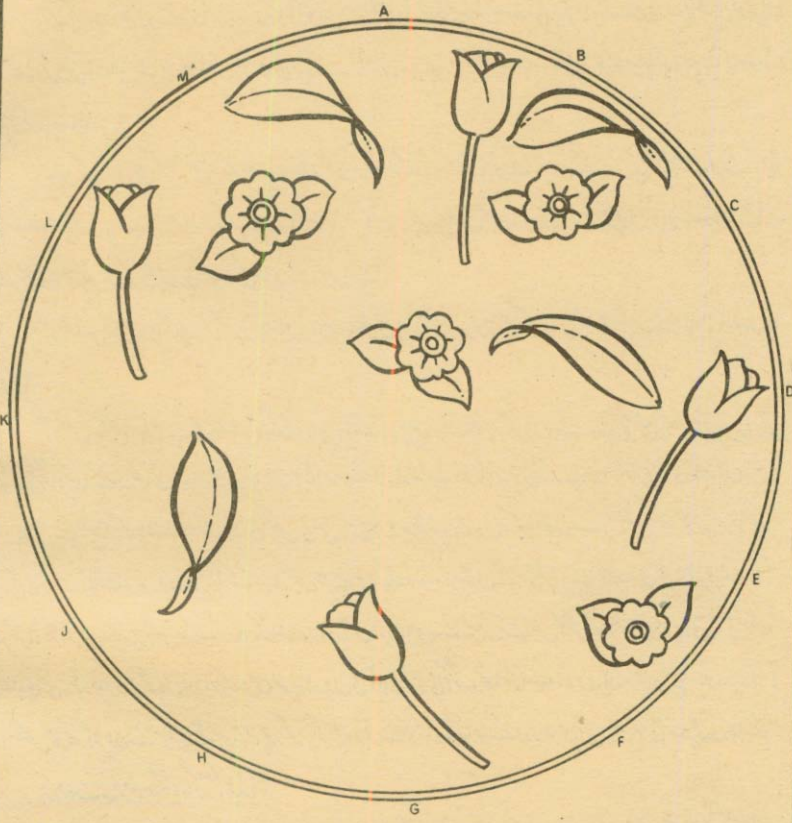

اس دائرے کو چار ٹکڑوں میں کاٹ کر اس طرح تقسیم کیجیے کہ ہر حصّے میں ایک پھول، ایک پتّا اور ایک گلِ لالہ آجائے۔ واضح رہے کہ آپ کو سیدھے خط کھینچ کر انہیں چار حصّوں میں تقسیم کرنا ہے۔

ماہانہ مقابلۂ معلومات

سوال در سوال

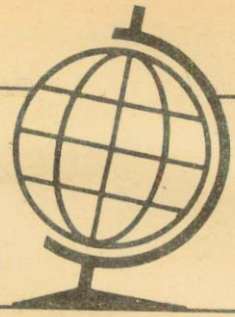

اسامہ بن سلیم

"سوال در سوال" مقابلہ نمبر ۶ اور اکتوبر ۸۸ء کے جوابات حاضر ہیں۔ اس بار نہ صرف یہ کہ بہت زیادہ ساتھی اس مقابلے میں شریک ہوئے بلکہ اکثر ساتھیوں نے تمام جوابات بھی درست بھجوائے۔ یہ یقیناً خوش آئند بات ہے۔ کبھی کبھار سوالات کا معیار جان بُوجھ کر مشکل کر دیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد سوائے اس کے کچھ اور نہیں ہوتا کہ جواب تلاش کرنے کی جستجو میں آپ وہ بہت کچھ بھی جان لیں جو اس سے قبل آپ کے علم میں نہ تھا۔۔۔ چونکہ ہر ماہ نئے نئے ساتھی بھی اس مقابلے میں شامل ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے شرکت کا طریقہ ہم ایک بار پھر بتا رہے ہیں۔

○ تمام سوالات کو بغور پڑھیے اور ان کے جوابات کوپن نما صفحے پر دیے ہوئے چھوٹے خانوں میں لکھ دیجیے۔ ○ پہلے جواب کا دوسرے سے اور دوسرے کا تیسرے سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔ آپ کے نزدیک جو بھی مضبوط اور قریب ترین تعلق ہے آپ اُسے کوپن نما صفحے پر دیے گئے مستطیل نما خانے میں لکھ دیجیے اور یہ کوپن ہمیں بھجوا دیجیے۔ مقابلے میں شرکت کی آخری تاریخ ۲۵ر دسمبر ہے۔ ○ قرعہ اندازی کے ذریعے تین انعامات بھی دیے جائیں گے۔ جس میں پہلا انعام ۱۰۰ر روپے اور بقیہ دو انعامات کُتب کی صورت میں ہوں گے۔

○ اپنے جوابات صاف اور خوش خط لکھیں۔ کوپن احتیاط سے کاٹیں۔ بغیر کوپن کے مقابلے میں شرکت ممکن نہیں۔

سوالات

۱۔ صدر، جنرل محمد ضیاء الحق حادثے کے وقت جس طیارے میں سوار تھے، اُس کا نام بتائیے؟

۲۔ ری پبلیکن اور ڈیموکریٹک کس ملک کی دو مشہور سیاسی پارٹیاں ہیں؟

۳۔ اطالوی مہم جُو ــــــــ مشہور ملّاح ــــــــ جو لاہے کا بیٹا جینوا میں پیدا ہوا، اسپین میں وفات پائی۔

۴۔ دنیا کی سب سے چھوٹی مذہبی ریاست "ویٹی کن سٹی اسٹیٹ" کس ملک میں واقع ہے؟

۵۔ مارسیلز، لیومس، طولوس اور نیس کس ملک کے مشہور شہر ہیں؟

۶- ایلبا جزیرے میں قید ہونے والا مشہور مغربی فاتح جس نے سینٹ ہیلینا جزیرے میں وفات پائی؟

۷- ۶ اکتوبر ۱۹۸۱ء کو فوجی پریڈ دیکھتے ہوئے کس اسلامی ملک کے صدر پر جان لیوا قاتلانہ حملہ ہوا؟

۸- ایران کی خفیہ تنظیم "ساوک" کی بنیاد کس شخصیت نے رکھی؟

۹- شاعر، فلسفی، منجم اور ریاضی کے عالم حکیم ابوالفتح عمر خیام کا تعلق کس ملک سے تھا؟

۱۰- مشہور فارسی شاعر جن کا اصل نام شرف الدین تھا۔ انہیں کس نام سے شہرت حاصل ہوئی؟

جوابات، سوال در سوال نمبر ۴

اکتوبر ۱۹۸۸ء

۱- دنیا کی پہلی خلانورد خاتون،

۲- روس

۳- تاشقند

۴- لال بہادر شاستری (وزیر اعظم)

۵- بھارت

۶- برما

۷- بہادر شاہ ظفر

۸- ایسٹ انڈیا کمپنی

۹- سانحہ جلیانوالہ

۱۰- امرتسر

جوابات کا باہمی تعلق

½ والن تینا نکولائیوا تریشکوا، پہلی خلانورد خاتون کا تعلق روس سے تھا۔

½ تاشقند، روس کے صوبہ ازبکستان کا صدر مقام ہے۔

½ لال بہادر شاستری نے معاہدہ تاشقند میں شرکت کی اور وہیں وفات پائی۔

½ لال بہادر شاستری کا تعلق بھارت سے تھا، وہ بھارت کے وزیر اعظم رہے۔

½ بھارت اور برما پڑوسی ملک ہیں۔

½ مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر برما کے شہر رنگون میں مدفون ہیں۔

½ بہادر شاہ ظفر انگریزوں کے عتاب کا شکار ہوئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی قائم کردہ حکومت ان کے زوال کا باعث ہوئی۔

½ سانحہ جلیانوالہ کا ذمہ دار جنرل ڈائر تھا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی قائم کردہ حکومت سے متعلق تھا۔

½ جلیانوالہ باغ، امرتسر (بھارت) میں واقع ہے۔

کوپن باہانہ مقابلۂ معلوماتِ عامّہ

دسمبر ۱۹۸۸ء

(۲)	(۱)	جواب نمبر ۱ اور ۲ کا تعلق
(۳)		جواب نمبر ۲ اور ۳ کا تعلق
(۴)		جواب نمبر ۳ اور ۴ کا تعلق
(۵)		جواب نمبر ۴ اور ۵ کا تعلق
(۶)		جواب نمبر ۵ اور ۶ کا تعلق
(۷)		جواب نمبر ۶ اور ۷ کا تعلق
(۸)		جواب نمبر ۷ اور ۸ کا تعلق
(۹)		جواب نمبر ۸ اور ۹ کا تعلق
(۱۰)		جواب نمبر ۹ اور ۱۰ کا تعلق

مقابلے میں شرکت کے لیے کوپن کا آنا ضروری ہے۔

حاصل کردہ نمبر

نام _____ مکمّل پتہ _____

"ووٹ تو یقیناً آپ بھی دیں گی"

مت بھولیے کہ آپ ملکی آبادی کا پچاس فیصد ہیں
قومی ترقی میں مردوں کے شانہ بشانہ چلیے۔ ملکی انتخاب
میں بھرپور حصہ لیجئے
قومی شناختی کارڈ کا حصول آپ کو اس اہم قومی فریضہ
کی ادائیگی کے قابل بناتا ہے

ڈائریکٹوریٹ جنرل آف رجسٹریشن۔ حکومت پاکستان، اسلام آباد

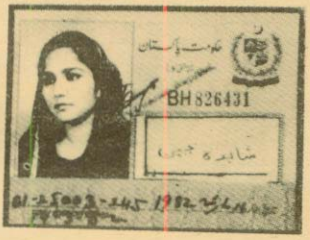

PID (I)
Orient

قرعہ اندازی کے ذریعے انعامات حاصل کرنے والے ۳ خوش نصیب ساتھی

(۱) محمد مصطفٰے، نشتر روڈ ملتان، اوّل انعام (۲) سیّد نوید علی ہاشمی، سنجھورو، ضلع سانگھڑ، دوم انعام
(۳) حسن مہدی خراسانی، انچولی، کراچی، سوم انعام

تمام درست جوابات ارسال کرنے والے ساتھی:-

• شارق شمیم، آگرہ تاج، کراچی -• محمد عمران احسن، اورنگی ٹاؤن، کراچی • کوپن پر نام نہیں لکھا • امین سیف الملوک، حسینی منزل، سانگھڑ • محمد عمران قادر، آسن داس محلہ، ٹنڈو آدم • محمد آفتاب، سکرڑ تحصیل چارسدہ • صدف موسٰی، میٹھادر، کراچی • نازش گلزار علی، گارڈن، کراچی • خرم عبدالحمید بٹ، گلشن اقبال، کراچی۔

ایک غلط جواب بھیجنے والے ساتھی:-

عمر فاروق بٹ، فرید ٹاؤن، ساہیوال • غلام حسین میمن، کھائی روڈ، حیدر آباد • عاصم عبدالحمید بٹ، گلشن اقبال، کراچی • محمد حنیف عبدالشکور، شاہی بازار، حیدر آباد

دو غلط جواب ارسال کرنے والے ساتھی:-

طارق محمود رفیق، گلبرگ، لاہور • ظہیر الٰہی بابر، ریلوے کالونی، حیدر آباد

تعلیم الاسلام ۴ حصے

اسلام کی بنیادی معلومات
جو آپ پر سیکھنا لازم اور سکھانا کارِ ثواب ہے

تالیف:- مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب

تعلیم الاسلام کے چاروں حصے مُفت منگوانے کے لیے
صرف ۲/ روپے کے ڈاک ٹکٹ ارسال کردیجئے۔

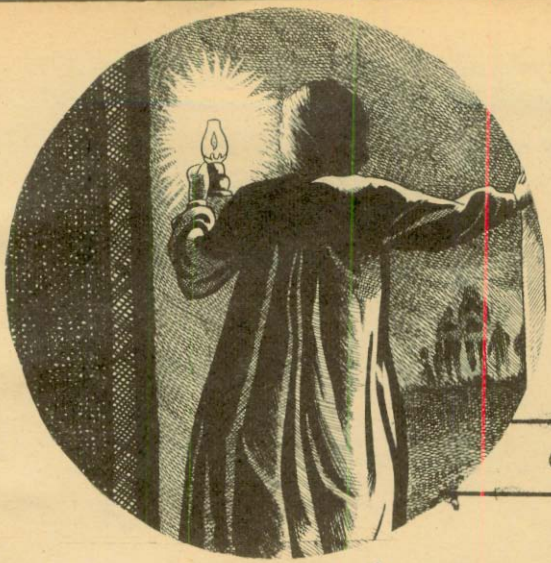

بارش

محمد پرویز آرائیں

برسات کا موسم شروع ہوا تو ایک دو بار موسلا دھار بارش ہوئی، مگر اس کے بعد بادل ایسے غائب ہوئے کہ آدھی برسات گزر گئی اور آسمان پر بادلوں نے ایک بار بھی آنے کا نام نہ لیا۔ پھر گرمی اس شدت کی کہ توبہ۔ ہوا بالکل بند، سب ہی پریشان تھے دعائیں مانگی جا رہی تھیں۔ چندے کی دیگیں پکا کر غریبوں کو کھانا کھلایا جا رہا تھا۔ سب کی نظریں آسمان پر لگی تھیں۔

ایک دن بھولا بھٹکا بادل کا ایک ٹکڑا کہیں آسمان پر نظر آیا تو لوگ خوشی سے چیخنے لگے۔ آج بارش ہوگی۔ آج اللہ نے ہماری سن لی۔ اور واقعی خدا نے اُن کی سن لی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے آسمان کالے کالے بادلوں سے گھر گیا اور موسلا دھار بارش ہونے لگی۔

ہماری گلی میں ایک شور مچا تھا۔ میں نے دروازے سے باہر جھانک کر دیکھا تو تقریباً آٹھ نو بچے منہ کالا کیے، ہاتھوں میں ڈنڈے لیے گاتے بجاتے ہنستے قلانچیں مارتے زور زور سے چیختے چلے جا رہے تھے۔

"کالے پیلے ڈنڈے ——— ہم اللہ کے بندے"۔ اُن کے پیچھے ننگ دھڑنگ بچوں کی ایک ٹولی شور مچاتی چلی آ رہی تھی۔

"برسو رام دھڑاکے سے ——— بڑھیا مر گئی فاقے سے!" بڑھیا کے نام سے مجھے اچانک وہ بڑھیا یاد آ گئی، جو ہمارے گھر سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک جھونپڑی میں رہتی تھی۔ بالکل تنہا۔ اس کا کوئی بھی تو نہیں تھا۔ ایک بیٹا تھا جو جوانی میں فوت ہو گیا تھا۔ جب تک ہاتھ پیروں میں جان تھی، بے چاری سلائی کر کے اپنا پیٹ پالتی رہی۔ مگر اب بے چاری میں اتنی طاقت بھی نہ تھی کہ چار قدم چل سکے۔ بی اماں ترس کھا کر صبح و شام اسے دو دو روٹیاں بھیج دیا کرتیں۔ اماں نے کئی بار کہا کہ "بڑی بی! تم یہیں آ جاؤ۔ ایک کوٹھری خالی ہے، اس میں رہنا۔" مگر اسے اپنی جھونپڑی سے نہ جانے کیوں اتنا پیار تھا کہ وہ اُسے چھوڑنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوئی۔

"بڑی نیک عورت ہے"، اکثر بی اماں آہ بھر کر کہتیں۔ مگر ہم نے آج تک اس بوڑھی عورت کی جھونپڑی نہیں دیکھی۔ مجھے ہی کیا، محلّے کے کسی بچّے کو بھی وہاں جانے کی اجازت نہیں ہے کیوں کہ سُنا ہے، اس جھونپڑی کے قریب جو پیپل کا درخت ہے، اس میں ایک کالا ناگ رہتا ہے اور پھر یہ کہ اس جھونپڑی کے سامنے بڑا گہرا گڑھا ہے، جو برسات کے دنوں میں پیالے کی طرح اُوپر تک لبالب بھر جاتا ہے۔ مگر بچّے کسی کے منع کرنے سے کب مانتے ہیں۔ بارش شروع ہوئی اور انھوں نے اُچھل کُود شروع کی۔ یہ شریر بچّے موسلا دھار بارش کی پروا کیے بغیر اُچھلتے کُودتے بڑھیا کی جھونپڑی کی طرف چل دیے اور زور زور سے چلّانے لگے۔

"برسو رام دھڑاکے سے ——— بڑھیا مر گئی فاقے سے"! بڑھیا نے جو بچوں کی آواز سُنی تو کانپ گئی۔ اس لیے نہیں کہ بچّے اُسے تنگ کر رہے تھے، بلکہ اس لیے کہ وہ جانتی تھی کہ یہ راستہ بہت خطرناک ہے۔ ابھی تو بارش شروع ہوئی تھی اگر تین چار گھنٹے اسی طرح مینہ برستا رہا تو گڑھے میں پانی بھر جائے گا۔ اور پھر سانپ کا ڈر۔ بڑھیا لاٹھی ٹیکتی اپنی جھونپڑی سے باہر آئی۔ شریر بچّوں نے اور زور سے چلّانا شروع کر دیا: "بڑھیا مر گئی فاقے سے"!

"ارے بچّو! تم یہاں کیسے آگئے؟ تمھارے ماں باپ نے تمھیں یہاں کیسے آنے دیا؟ جاؤ، اپنے گھر جاؤ۔ رات ہونے والی ہے۔ راستہ خطرناک ہے۔"

"جا جا، بڑھیا! تیری جھونپڑی میں آئیں تو بھگا دینا۔ یہ زمین کیا تیری ہے؟" ایک بے حد بے ہُودہ بچّے نے اکڑ کر کہا اور سارے بچّے قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

"اچھا تو تم اس گڑھے کی طرف مت جانا۔" بے چاری بڑھیا ڈرتے ڈرتے بولی۔

"ہم تو جائیں گے ——— جائیں گے ——— جائیں گے۔" سب بچّے کورس میں چیخنے لگے اور بڑھیا کا مُنہ چڑاتے، انگوٹھا دکھاتے بھاگے۔ ایک لڑکے نے چلتے چلتے بڑھیا کو دھکّا بھی دے دیا، بڑھیا گڑھے میں جا گری۔

عثمان رحم دل تھا۔ بچّوں کی ٹولیاں آگے نکل گئیں۔ مگر وہ چُپ چاپ اپنی جگہ کھڑا رہا اور پھر بڑھیا کے پاس آکر بولا —

"بوڑھی اماں! تم اپنی جھونپڑی میں جاؤ۔ یہ بہت خراب ہیں۔ لو دیکھو، میں نے تمھارا کہنا مان لیا ہے۔ میں گھر واپس جا رہا ہوں۔"

بڑھیا کی آنکھوں میں کچھ چمک سی آئی۔ درد بھری آواز میں بولی: "بیٹا تم جا تو رہے ہو۔ میرا ایک چھوٹا سا کام کر دو۔ چار آنے کا مٹّی کا تیل نکڑ والی دُکان سے لا دو۔ میں چل نہیں سکتی۔"

حالانکہ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی مگر رحم دل عثمان نے انکار نہیں کیا۔ وہ دوڑ کر مٹّی کا تیل لے آیا۔ کالی گھٹا کی وجہ سے یوں بھی ماحول بڑا اندھیرا اور ڈراؤنا ہو رہا تھا اور پھر رات بھی ہو گئی تھی۔ راستے میں پیپل کا پیڑ تھا۔ عثمان اکیلے گھر جاتا ہوا ہچکچا رہا تھا۔ بڑھیا بولی: "بیٹا، تھوڑی دیر ان بچّوں کا انتظار کر لو۔ جب وہ آجائیں تو ان کے ساتھ ہی چلے جانا۔ اتنی دیر یہیں میرے

پاس بیٹھو۔ میں تمھیں ایک کہانی سُناتی ہوں۔" عثمان بڑھیا کے پاس جا بیٹھا اور وہ اسے بڑے پیار سے کہانی سُناتی رہی۔
اچانک بوڑھی عورت چونک کر اُٹھی۔

"بیٹا! رات ہو گئی ہے، چراغ جلا دُوں، بچّے آتے ہی ہوں گے۔" بڑھیا نے چراغ میں تیل ڈالا اور جھونپڑی میں اس طرح اسے جلا کر رکھا کہ سامنے کے راستے پر روشنی پڑتی رہے اور آنے والے اس گڑھے میں نہ جا گریں، جو اب مستقل بارش کی وجہ سے بھر گیا تھا۔ ادھر جو بچّے شور مچاتے دُور نکل گئے تھے، پہلے تو اپنی دُھن میں مست گاتے بجاتے رہے۔ مگر جب رات ہوئی تو ان کے دِل ہل گئے۔ ایسی بھیانک کالی رات میں وہ پانی کے گڑھے اور پیپل کے درخت کے پاس سے کیسے گزریں گے۔ کچھ بچّے مُنہ بسورنے لگے۔ کچھ نے باقاعدہ ریں ریں شروع کر دی اور کچھ پچھتانے لگے کہ کیوں اُنھوں نے بوڑھی عورت کی بات نہیں مانی۔ جس طرح انھوں نے بڑھیا کو گڑھے میں دھکا دیا تھا، اگر اب وہ خود اس میں گر جائیں تو؟ ڈرتے ڈرتے، ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے وہ چلے آ رہے تھے۔ تھوڑا آگے آئے تو انھیں کچھ دُور روشنی سی نظر آئی۔ اس روشنی سے وہ تھوڑا بہت راستے کا اندازہ کر سکتے تھے۔ وہ روشنی کی طرف بڑھتے رہے۔ آہستہ آہستہ روشنی ان کے قریب ہوتی گئی۔ سامنے ہی وہ بڑا سا گڑھا نظر آ رہا تھا جس کا انھیں ڈر تھا۔ اُسے دیکھتے ہی وہ سب لرز اُٹھے کیوں کہ وہ پانی سے بھرا تھا۔ اگر روشنی نہ ہوتی تو وہ یقیناً اس گڑھے میں ڈوب جاتے۔ تھوڑا ہی آگے بڑھیا کی جھونپڑی تھی۔ وہ اچانک ٹھٹک کر رہ گئے۔ بُوڑھی عورت دیا لیے کھڑی تھی، عثمان بھی اس کے ساتھ تھا۔ بچّوں کے سر شرمندگی سے جُھکے جا رہے تھے۔ جسے انھوں نے چڑایا، دھکا دیا، اُسے ان کا کتنا خیال تھا۔ وہ سب دوڑ کر بڑھیا کے پاس پہنچے اور اُسے چاروں طرف سے گھیر کر بولے۔" بوڑھی اماں! ہمیں معاف کر دو۔"

"کہاں رہ گئے تھے میرے بچّو؟ میں تو ڈر رہی تھی، اس اندھیرے میں تم کیسے آؤ گے۔ تمھارے لیے دُعائیں مانگ رہی تھی۔ اچھا اب تم سب جاؤ۔ بارش رُک گئی ہے۔ تمھارے گھر والے پریشان ہوں گے۔ لو عثمان بیٹے! یہ چراغ لے کر تم آگے آگے چلو۔ مجھ میں طاقت ہوتی تو میں خود تم سب کو چھوڑ آتی۔"

"مگر بوڑھی اماں! تم اندھیرے میں کیسے رہو گی؟" عثمان جلدی سے بولا۔

"نہیں میرے بچّے! میں اندھیرے میں رہنے کی عادی ہوں۔ مجھے چراغ کی کیا ضرورت ہے؟ میں نے تمھارے ہی لیے یہ چراغ جلایا تھا۔ جاؤ بچّو! میں تمھارے لیے دُعا مانگوں گی کہ صحیح سلامت گھر پہنچو۔ اور دیکھو! رات کو ایسے گھر سے کبھی مت نکلا کرو۔" سب ہی بچّوں کے گھر والے پریشان تھے۔ بارش تھم چکی تھی۔ ادھر جب لوگوں نے دیکھا کہ ایک ننھا سا بچّہ چراغ لیے آگے آگے چلا آتا ہے اور اس کے پیچھے تمام بچّے قطار میں خاموشی سے چلے آ رہے ہیں تو بچّوں کی اس انوکھی ادا پر ناراضگی کے باوجود سب کو پیار آ گیا۔ اس دن کے بعد سے تمام بچّوں نے عہد کیا کہ وہ آئندہ کسی کو نہیں ستائیں گے اور... اور ہاں! روزانہ بوڑھی اماں سے ملنے جایا کریں گے۔

نئی تحریریں

"نئی تحریریں" نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کے لیے شروع کیا گیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ آپ کے اندر کی چھپی ہوئی صلاحیتیں نکھر کر سامنے آئیں۔

اس لیے تحریر روانہ کرتے وقت ان باتوں کا خیال رکھیے۔

- تحریر کاغذ کے ایک جانب ایک سطر چھوڑ کر خوشخط لکھی گئی ہو۔
- تحریر نقل شدہ نہ ہو۔
- اپنا نام اور پتہ صاف صاف لکھیے۔

(ادارہ)

پرچم

مرسلہ - فوزیہ

پرچم اپنا پیارا پیارا
سب سے اچھا سب سے نیارا
لہرائے تو مہکے خوشبو
دھوم مچی ہے اس کی ہر سُو
چمکے اس پر چاند ستارا
پرچم اپنا پیارا پیارا
اِس کی عظمت اپنی آن
اس پر جاں اپنی قربان
اپنے وطن کی شان بڑھائے
یہ پرچم جب بھی لہرائے

اسکول جانے والے

تختی گھمانے والے — بستہ اُٹھانے والے
سب گورے اور کالے — معصوم بھولے بھالے
کیا غُل مچا رہے ہیں
اسکول جا رہے ہیں

بچّے یہ پیارے پیارے — اپنے وطن کے تارے
یہ قوم کے دُلارے — ماؤں کے یہ سہارے
پاؤں بڑھا رہے ہیں
اسکول جا رہے ہیں

پڑھ لکھ کے یہ وطن کی — عزت بڑھانے والے
پرچم اُٹھانے والے — دُنیا پہ چھانے والے
وہ دیکھو آ رہے ہیں
اسکول جا رہے ہیں

مرسلہ :- فردوس کوثر - لاہور

ٹنگو میاں

دُرِّ شہوار شفیع ۔ کراچی

کہتے ہیں نام کا اثر شخصیت پر ضرور پڑتا ہے ۔ معلوم نہیں آپ اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں یا نہیں مگر ہم ضرور کرتے ہیں۔ یا یوں کہیے کہ ٹنگو میاں کو دیکھنے کے بعد سے کرتے ہیں۔ چھوٹا سا قد۔ باہر کو نکلا ہوا... ڈھولک سا پیٹ، سر پر گول ٹوپی ۔ قد سے بڑے سائز کا کُرتا، پاجامہ ۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ اس حلیے سے آپ کے ذہن میں "ٹنگو" کے سوا کوئی دوسری شخصیت آ ہی نہیں سکتی ۔ چاہے آپ نے ٹنگو کو دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو۔ ٹنگو میاں کا نام، ان کے والدین نے تنویر رکھا تھا مگر چند ذہین محلّے والوں نے اس نام کو غیر مناسب پاتے ہوئے انہیں ٹنگو پکارنا شروع کر دیا ۔ رفتہ رفتہ تنویر میاں جگت ٹنگو بن گئے ۔ ٹنگو کو اپنا یہ نام سخت ناپسند تھا ۔

ٹنگو میاں کے ظاہری حلیے کی طرح ان کی عادتیں بھی عجیب وغریب تھیں ۔ وہ اپنی عمر کے بچّوں کے بجائے بڑے لوگوں میں بیٹھنا پسند کرتے تھے ۔ کمر کے پیچھے یوں ہاتھ باندھ کر گھومتے جیسے ستّر سال کے بوڑھے ہوں

ٹنگو کے تین شوق تھے ۔ خوب کھانا، خوب سونا، اور جاسوسی کہانیاں پڑھنا ۔ کھانے سے ان کی صحت اور سونے سے اُن کی پڑھائی مسلسل متاثر ہوتی رہتی ۔ وہ کھاتے تو یوں لگتا جیسے کھانے کے لیے ہی پیدا ہوئے ہیں اور سوتے تو یوں لگتا جیسے کبھی سو کر ہی نہیں اُٹھیں گے .... مگر اُنہیں ہر روز اُٹھنا اور اُٹھ کر اسکول جانا پڑتا تھا ۔ جاسوسی کہانیوں نے ٹنگو کو درسی کتابوں سے دُور کر دیا تھا ۔

اسکول دیر سے جانا ٹنگو کا معمول تھا ۔ نتیجتاً ماسٹر صاحب کے مولا بخش سے ان کی روز ملاقات ہوتی ۔ وہ روز ماسٹر صاحب سے اسکول وقت پر آنے کا وعدہ کرتے مگر یہ وعدہ کبھی وفا نہ ہوتا ۔ ماسٹر صاحب اور گھر کے لوگ ٹنگو کی دوسری عادتوں کو تو برداشت کر لیتے، مگر اسکول دیر سے جانا اور ہوم ورک نہ کرنا ۔ ان سب کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتا ۔ ٹنگو کی امّی تو خاص طور پر اُن کی اس عادت پر برہم ہوتی رہتیں ۔

"اٹھو نیستی، سورج سر پر چڑھ آیا ہے ۔" وہ ٹنگو میاں کو ہر روز صبح سویرے ڈانٹتیں ۔ ٹنگو میاں چادر منہ پر سے ہٹا کر سر کے اوپر چھت کو گھورتے اور سورج کو غیر موجود پا کر دوبارہ چادر اوڑھ کر سو جاتے ۔ کبھی کوئی ملنے والی ٹنگو میاں کی امّی کے پاس آتی تو نو بجے تک ٹنگو میاں کو چادر اوڑھے سوتا دیکھ کر پوچھتی

"کیا ٹنگو میاں بیمار ہیں ؟"

"نہیں بہن، سو رہا ہے ۔ دراصل رات دیر سے سویا تھا نا" اس کی امّی وضاحت کرتیں ۔ ٹنگو میاں

نہ صرف یہ کہ دیر سے اسکول جاتے تھے، بلکہ ہوم ورک بھی کر کے نہیں لے جاتے تھے۔ کلاس ٹیچر عابد علی پوچھتے۔

"ٹنگو۔ ہوم ورک کیوں نہیں کر کے لائے؟"

"سر، وہ مہمان آگئے تھے۔" جواب ملتا۔

"کل بھی مہمان آگئے تھے۔ پرسوں بھی مہمان آگئے تھے۔ کیا تمہارے ہاں ہر روز کسی کی شادی ہوتی ہے؟" ماسٹر صاحب غصّے سے کہتے۔ ماسٹر صاحب ٹنگو پر سزا کے سب طریقے آزما چکے تھے مگر ٹنگو میاں کی کسی عادت میں ذرّہ برابر بھی فرق نہ آیا تھا۔ ٹنگو میاں ہر سزا کو یوں مسکرا کر برداشت کرتے جیسے سزا کی توہین کرنا ان کا بنیادی فرض ہو۔

ایک روز اسکول میں انٹرول تھا۔ ٹنگو میاں کی کلاس کے سب لڑکے باہر میدان میں کھیل رہے تھے۔ مگر ٹنگو میاں کلاس میں بیٹھے "بھوت محل کی کہانی" جو انہوں نے کل ہی خریدی تھی۔ پڑھنے میں مگن تھے۔۔۔ بھوتوں کی کہانی پڑھنے کا یہ ان کا پہلا تجربہ تھا۔ اس سے پہلے وہ صرف جاسوسی کہانیاں پڑھا کرتے تھے، وہ جوں جوں بھوت محل کی کہانی پڑھتے جا رہے تھے۔ ان کے چہرے پر خوف اور حیرت کے تاثرات طاری ہوتے جاتے تھے۔ ٹنگو میاں کہانی پڑھتے پڑھتے جب وہاں پہنچے جہاں بھوت ایک انسانی کردار کا گلا دباتا ہے تو ان کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ ماسٹر عابد علی اس وقت کمرے کے پاس سے گزر رہے تھے۔ چیخ سن کر وہ تیزی سے کمرے میں داخل ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ ٹنگو میاں بنچ پر بیٹھے تھر تھر کانپ رہے ہیں۔

"کیا ہوا ٹنگو؟" انہوں نے ٹنگو کے پاس جا کر پوچھا

"سر... بھوت۔" ماسٹر جی کی نظر ٹنگو کی بنچ پر رکھی کتاب کے ٹائیٹل پر پڑی۔ "بھوت محل کی کہانی"۔ ماسٹر صاحب کتاب کا ٹائیٹل پڑھتے ہوئے بُدبُدائے۔ اور ایک لمحے میں ساری بات سمجھ گئے۔ انہوں نے ٹنگو کی ہمت بندھائی اور کتاب اُٹھا کر کلاس سے باہر نکل گئے۔ کلاس سے باہر نکلتے ہوئے ان کے ذہن میں اچانک ایک خیال آیا اور وہ مسکرا دیے۔

اس واقعے کے تیسرے روز ٹنگو حسبِ معمول ہوم ورک کر کے نہ لائے تو کلاس ٹیچر عابد علی نے ان کا کان اینٹھتے ہوئے کہا۔

"آج تمہاری سزا یہ ہے کہ تم چھٹی کے بعد شام سات بجے تک اسکول کے نیم کے درخت کے نیچے ہاتھ اُٹھائے کھڑے رہو گے۔" یہ سنتے ہی ٹنگو میاں کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ گویا یہ سزا بھی اُن کے شایانِ شان نہ تھی۔ چھٹی کے بعد ماسٹر عابد علی نے ٹنگو میاں کے پاس اسکول کے چپراسی علم دین کو بٹھایا اور گھر روانہ ہو گئے۔ آہستہ آہستہ شام ہونے لگی۔ سردیوں کا موسم تھا۔ اس لیے چھ بجے تک اچھا خاصا اندھیرا پھیل گیا تھا۔ چھ بجے علم دین سگریٹ لینے باہر چلا گیا۔ ابھی علم دین کو گئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ٹنگو میاں کو نیم کے درخت کے عقب میں واقع گیلری میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ٹنگو میاں نے گھوم کر دیکھا تو اُن کے ہوش اُڑ گئے۔ ایک بھوت دھیرے دھیرے ان کی جانب بڑھ رہا تھا۔ بھوت کے بڑے بڑے بال اس کے کندھوں پر پڑے تھے اور اس کے

دانت ہاتھی کے دانتوں کی طرح باہر کو نکلے ہوئے تھے . . .
ٹنگو میاں بھوت کو دیکھ کر اتنے خوفزدہ ہوئے کہ بھاگ بھی نہ سکے ۔

"تم ٹنگو ہونا؟" بھوت نے ٹنگو سے چند قدم دور کھڑے ہو کر سوال کیا۔

"جج ... جج ... جی" ٹنگو نے کپکپاتی آواز میں تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"سُنا ہے تم ہر روز دیر سے اسکول آتے ہو اور ہوم ورک کر کے نہیں لاتے ہو؟"

"کٹ کٹ کٹ کٹ" ٹنگو میاں نے کچھ کہنا چاہا مگر صرف دانت بجا کر رہ گئے۔

"بولتے کیوں نہیں" بھوت نے ڈانٹتے ہوئے کہا . . .

"آ... ئندہ ... ایسا ... نن ... نہیں ہو گا"

"وعدہ"؟

"وعدہ" ٹنگو نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"یاد رکھو اگر تم نے اپنا وعدہ بھلایا تو میں تمہارے گھر بھی آسکتا ہوں" بھوت نے کسی فلم کے ولن کی طرح دھاڑ کر کہا۔ تبھی علم دین سگریٹ لے کر واپس آگیا۔ ٹنگو میاں دوڑ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ علم دین ٹنگو کو تسلی دیتے ہوئے لمحے بھر کو مسکرایا، بھوت جس طرف سے آیا تھا تیزی سے اُسی طرف چلا گیا۔

اگرچہ اس واقعے کے بعد دو دن تک ٹنگو میاں بخار میں مبتلا رہے مگر جیسے ہی اُن کا بخار اُترا اُن کی عادتوں میں حیرت انگیز تبدیلیاں آگئیں۔ اب وہ نہ صرف یہ کہ جلدی اُٹھنے لگے تھے۔ بلکہ ہوم ورک مکمل کر کے صحیح وقت پر اسکول بھی جانے لگے تھے۔ ماسٹر عابد علی نے ایک ہفتے بعد ٹنگو کے گھر جا کر اُن کی امی کو ٹنگو میاں کی عادتوں میں آنے والی تبدیلیوں کے بارے میں بتایا تو وہ خوش ہو گئیں۔ انہوں نے ماسٹر صاحب کو ان کی اسکیم کی کامیابی پر مبارکباد دی۔ اب ٹنگو میاں ہر اعتبار سے ایک اچھے بچے بن چکے تھے۔ شاید اسی لیے بہت سے لوگ انہیں ٹنگو کی بجائے تنویر کہہ کر پکارنے لگے تھے۔

دنیا کا پہلا اخبار

مُرسلہ : عباد علی سحر ناز لاھور

بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ دنیا میں پہلا اخبار چین سے دسویں صدی قبل مسیح میں شائع ہوا اس کا نام "کین بان" تھا۔ خیال ہے کہ یہ ایک ہزار سال تک لگاتار شائع ہوتا رہا تھا۔

یورپ میں پہلا اخبار ۵۸ قبل مسیح میں جولیس سیزر نے جاری کیا اس کا نام "اکٹا پوپولی" یعنی عوامی اخبار تھا۔ اگرچہ اکٹا پوپولی سرکاری اہتمام میں شائع ہوتا تھا۔ لیکن طباعت و کتابت اور کاغذ کا معیار نہایت پست تھا۔

کچھ مؤرخین بتاتے ہیں کہ دنیا کا پہلا اخبار جرمنی کے شہر سٹارسبورگ سے ۱۶۰۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کا نام "سٹارسبورگ ریلیشن" تھا اور یہ ہفتہ وار شائع ہوتا تھا۔ چند سال بعد ایک اور اخبار فرینکفورٹ

سے نکلنے لگا۔

۱۶۳۱ء میں فرانس سے ایک اخبار "لاجازیت" شائع ہوا۔ اس کا مالک شاہ لوئی چہار دہم کا ایک پادری تھا۔ اسی زمانے میں انگلستان سے بھی ایک اخبار نکلا۔ جو ۱۶۴۱ء میں چارلس اوّل نے بند کر دیا جس کی وجہ یہ تھی کہ سٹیورٹ خاندان کے بادشاہوں نے چونکہ آزادانہ اظہارِ فکر پر سخت پابندیاں لگا رکھی تھیں۔ اس کے بعد ایک مدت تک صحافت پا بہ زنجیر رہی لیکن مکمہ این کے زمانے میں ان پابندیوں کو کچھ کم کر دیا گیا۔

اسی طرح اٹلی میں صحافت کا آغاز بھی اسی زمانے سے ہوا۔ اور یہی حال اسپین کا تھا۔ ۱۷۶۰ء میں "گزٹیاری میڈریڈ" منظر عام پر آیا۔

امریکہ میں پہلا اخبار ۱۷۰۴ء میں "بوسٹن نیوز لیٹر" کے نام سے شائع ہوا۔

اٹھارہویں صدی کے نصف میں اخبارات کا حلقہ اشاعت وسیع ہونا شروع ہو گیا۔

عرب ممالک میں صحافت کا آغاز ۱۸۰۰ء میں ہوا۔ سب سے پہلے نپولین نے دو اخبار فرانسیسی زبان میں مصر سے شائع کیے۔ پہلا اخبار "الوقائع المصریہ" ۱۸۲۸ء میں شائع ہوا۔ الجزائر میں فرانسیسی استعمار نے عربی میں پہلا اخبار ۱۸۴۸ء میں جاری کیا لبنان میں پہلا عربی اخبار ۱۸۵۸ء میں نکلا۔ جس کا نام "حدیقۃ الاخبار" تھا۔

۱۸۶۰ء میں تیونس سے "الرائد التونسی" اخبار شائع ہوا۔

۱۸۶۶ء میں لیبیا سے ترک گورنر نے ترکی اور عربی میں دو اخبار شائع کئے جن کا نام "طرابلس الغرب" تھا۔

عراق میں پہلا اخبار "الزوراء" ترکی اور عربی دونوں زبانوں میں شائع ہوا۔ ۱۸۷۹ء میں یمن سے ایک سرکاری جریدہ شائع ہوا۔ سوڈان سے پہلا اخبار ۱۸۹۹ء میں "الغازیتہ" جاری ہوا اردن میں صحافت کا آغاز ۱۹۲۰ء میں "صوت الحق" اخبار سے ہوا۔ تقریباً اسی دور میں مکہ مکرمہ سے "اُمّ القریٰ" اخبار شائع ہوا۔ یہ سب اگرچہ سرکاری اہتمام میں شائع ہوا کرتا تھا تاہم جلد ہی ان ممالک میں آزاد اور عوامی صحافت کی ضرورت پڑ گئی۔

برصغیر میں سب سے پہلا اخبار "دہلی گزٹ" کلکتے سے ۱۷۸۱ء میں جیمز آگسٹس نے جاری کیا۔ ۱۷۸۴ء میں کلکتے سے "ہرکارہ" شائع ہوا۔ اس کا مالک بھی ایک انگریز تھا۔ پہلا دیسی اخبار فارسی میں "جام جہاں نما" کے نام سے ۱۸۲۲ء میں کلکتے ہی سے نکلا۔ ۱۸۲۳ء میں اس کے ساتھ اردو ضمیمہ بھی شائع ہونے لگا۔ ۱۸۳۱ء میں "آئینہ سکندر" اور ۱۸۳۵ء میں سلطان الاخبار شائع ہوا۔

۱۸۴۷ء میں قلعہ معلیٰ سے فارسی زبان میں "سراج الاخبار" شائع ہوا۔ یہ دراصل بہادر شاہ ظفر کے عہد کا "کورٹ گزٹ" تھا۔

اسی طرح کراچی سے پہلا اخبار "مفرح القلوب"

۱۸۵۶ء میں شائع ہوا۔ اور ۱۸۵۷ء تک شائع ہوتا رہا۔

اردو میں دہلی سے پہلا اخبار ۱۸۳۷ء میں مولوی محمد باقر نے نکالا ۱۸۳۷ء میں سرسید احمد خان کے بڑے بھائی سید محمد خان نے دہلی سے "سید الاخبار" اخبار جاری کیا۔

دوستی

کامران سلیم ، نارتھ ناظم آباد، کراچی

ناصر ایک ذہین اور فرمانبردار لڑکا تھا۔ وہ ہمیشہ کلاس میں اچھے نمبروں سے پاس ہوتا اور اپنے بڑوں کا کہا مانتا ان خصوصیات کی وجہ سے گھر اور باہر کے سب لوگ اس کی تعریف کرتے اور اُسے عزیز رکھتے تھے۔ ناصر خود جتنا اچھا تھا اُسے دوست بھی اتنے ہی اچھے ملے تھے۔ ذہین، محنتی اور فرمانبردار۔ ناصر کو اپنے دوستوں سے بہت پیار تھا وہ سب اُس کا خیال بھی تو بہت رکھتے تھے۔ کھیل کا میدان ہو یا پڑھائی کا سلسلہ، کوئی مشکل ہو یا مسئلہ ناصر کے دوست ہمیشہ اُس کے ساتھ ہوتے۔

ابھی کچھ دن پہلے ناصر کے امتحانات ختم ہوئے تھے اور گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہوئی تھیں کہ حیدر آباد سے اس کے چچازاد بھائی خالد کا خط موصول ہوا لکھا تھا کہ وہ دو روز بعد کچھ دنوں کے لیے اُن کے ہاں آرہا ہے۔ خالد کی آمد کی اطلاع پاتے ہی ناصر خوشی سے جھوم اُٹھا "ہُرّے اب مزہ آئے گا" ناصر نے نعرہ لگایا اور پھر اپنے دوستوں کو خالد کی آمد کی خبر سُنانے باہر دوڑ گیا۔ ناصر کے دوست بھی خالد کے آنے کی خبر سُن کر بہت خوش ہوئے۔ اُنہیں ایک اور دوست بنانے کا موقع جو ملنے والا تھا۔

دو روز بعد جب ناصر کے دوست اکٹھے ہو کر ناصر کے گھر خالد سے دوستی کرنے آئے تو اُنہیں بڑی مایوسی ہوئی۔ خالد نے کسی کے ساتھ سیدھے منہ بات نہ کی۔ ناصر کے ایک دوست نے جب اُس سے اُس کے اسکول اور دلچسپیوں کے بارے

میں پوچھا تو اس نے گول گپّے کی طرح منہ پھُلا کر گول مول سے جوابات دیے۔ جب تک کہ ناصر کے دوست خالد کے ساتھ بیٹھے رہے، وہ وقفہ وقفہ سے اپنی شرٹ کا کالر اور پینٹ کی کریز درست کرتا رہا۔

"خالد کچھ مغرور ہے" ناصر کے دوست شاہد نے ناصر کے گھر سے باہر نکلتے ہوئے تبصرہ کیا۔

"ہونہہ.... ایسے گردن اکڑا کر اور منہ بگاڑ بگاڑ کر انگریزی بول رہا تھا جیسے انگریزی اُسی نے ایجاد کی ہو" ایک اور دوست نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

ناصر کے دوست جیسے ہی ناصر کے گھر سے نکلے خالد نے ناصر سے کہا "یہ تم نے کیسے کیسے اُول جلُول سے دوست بنائے ہوئے ہیں"

"کیا مطلب؟" ناصر نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"یاران میں سے دو تین تو بہت ہی غریب گھرانوں کے لگتے ہیں۔"

"تو اس سے کیا ہوتا ہے وہ سب بہت ذہین، محنتی اور با اخلاق ہیں۔"

"نہیں یار اوّل تو ایسے لڑکوں کو دوست نہیں بنانا چاہیے اور اگر بنا بھی لیا جائے تو انھیں ذرا رُعب میں رکھنا چاہیے۔ اس سے عزت بڑھتی ہے۔" ناصر نے کہا۔

"رُعب جمانے سے عزت بڑھتی ہے؟" ناصر نے حیرت سے پوچھا۔

"تو اور کیا۔ میں رُعب اور دبدبے کی بنا پر اپنی کرکٹ ٹیم کا کپتان ہوں۔ اگر تم بھی اپنی ٹیم کے کپتان بننا چاہتے ہو تو کھیلتے وقت اپنی تعریف کیا کرو اور دوسروں کو معمولی معمولی غلطیوں پر ٹوک دیا کرو۔" خالد نے آنکھیں گھماتے ہوئے ناصر کو مشورہ دیا۔

خالد نے ناصر کو دوستوں کے ساتھ سلوک کے اور بھی بہت سے طریقے بتائے۔ ناصر کو خالد کی باتیں عجیب لگ رہی تھیں مگر کپتان بننے والی بات اُسے کچھ کچھ بھا گئی تھی۔

دوسرے دن شام کو جب ناصر اپنے دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیل رہا تھا تو اُس نے نعیم کی بولنگ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

"نعیم آخر تمہیں ہاتھ گھما کر بولنگ کرنی کب آئے گی۔ تم تو ابھی تک گیند کو پتھر کی طرح دے مارتے ہو۔" نعیم نے حیرت سے ناصر کی طرف دیکھا۔ تھوڑی دیر بعد ناصر نے بیٹنگ کرتے ہوئے ایک زوردار شاٹ کھیلا۔ گیند سلی مڈ آف پر کھڑے ہوئے عامر کے منہ پر جا لگی۔ پہلے کی بات ہوتی تو ناصر فوراً عامر سے معافی مانگ لیتا مگر اس وقت اس نے اُلٹا عامر کو ڈانٹا۔ "آخر تم میرے سر پر چڑھ کر کیوں کھڑے تھے۔" کپتان ریحان کو ناصر کی بات ناگوار گزری۔

"یہ کیا بات ہوئی ناصر! غلطی تو تم سے ہوئی ہے اور تم اُس پر اُلٹا ڈانٹ رہے ہو عامر کو تمہیں عامر سے معافی مانگنی چاہیے۔" ریحان نے غصّے سے کہا۔

"اوہو بڑے آئے حمایتی۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا ناصر کہ تمہارے دوست بدتمیز ہیں۔ ان سے دوستی ختم کر دو، مگر تم مانتے ہی نہیں۔" خالد جو ناصر کے ساتھ کھیلنے آیا ہوا تھا ناصر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ناصر نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر خالد اُس کا ہاتھ پکڑ کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ دونوں گھر پر آکر وڈیو گیم کھیلنے لگے۔ ناصر اس واقعے کو صبح تک بھول گیا۔

اگلے دن ناصر کا دوست راشد ناصر کے پاس آیا اور بولا "ناصر میری بہن نے بازار سے کتاب منگوائی ہے ذرا بازار تک جانے کے لیے اپنی سائیکل دے دو۔"

"ہاں ہاں لے جاؤ۔ ٹھہرو میں ابھی لاتا ہوں۔" ناصر یہ کہہ کر سائیکل لینے گھر میں چلا گیا۔ خالد نے ناصر کو سائیکل گھر سے باہر لے جاتے دیکھا تو پوچھا۔

"سائیکل کہاں لے جا رہے ہو؟"

"وہ میرا دوست راشد ذرا بازار تک جا رہا ہے اُسے دے رہا ہوں۔" ناصر نے سائیکل باہر لے جاتے ہوئے کہا۔

"ارے تمہاری سائیکل تو بالکل نئی ہے۔ کہیں توڑ پھوڑ نہ لائے وہ اسے۔ بہتر ہے بہانہ بنا دو.... کہہ دو سائیکل پنکچر ہے۔" خالد نے ناصر کو مشورہ دیا۔

"مگر راشد میرا بہت عزیز دوست ہے وہ ناراض ہو جائے گا تو میں کس کے ساتھ کھیلوں گا؟" ناصر نے قدرے پریشانی کے ساتھ کہا۔

"ارے میں جو ہوں" خالد نے ناصر کی تشویش کو دُور کرنے کے لیے کہا۔ ناصر نے سائیکل جہاں سے اُٹھائی تھی وہیں رکھ دی اور باہر آکر راشد سے کہہ دیا کہ سائیکل پنکچر ہے۔

تھوڑی بعد خالد، ناصر کے ساتھ سائیکل پر بیٹھ کر بازار کے لیے نکلا تو راستے میں راشد سے ملاقات ہوگئی۔ راشد نے مُسکراتے ہوئے ناصر کی جانب اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ "اچھا تو سائیکل پنکچر تھی"۔ راشد کو مُسکراتا دیکھ کر ناصر کو انتہائی شرمندگی کا احساس ہوا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔

خالد کو ناصر کے ہاں آئے ہوئے پندرہ دن ہو چکے تھے۔ ان پندرہ دنوں میں اُس نے ناصر کے تمام دوستوں کو ناصر سے دُور کر دیا تھا۔ چونکہ خالد ابھی ناصر کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا اس لیے ناصر کو اکیلے پن کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن جس دن خالد نے حیدر آباد واپس جانے کا اعلان کیا۔ اُس دن ناصر کو محسوس ہوا کہ وہ بالکل اکیلا رہ گیا ہے۔

خالد کو حیدر آباد واپس گئے آج دوسرا دن تھا۔ ان دو دنوں میں ناصر گھر سے بالکل بھی باہر نہیں نکلا تھا، لیکن تیسرے روز اُس سے اکیلا پن برداشت نہ ہوا۔ اور وہ گھر سے نکل کر سامنے والے میدان میں چلا گیا۔ جہاں اُس کے تمام دوست کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ناصر بڑی دیر تک میدان کے ایک کونے میں کھڑا اپنے دوستوں کی طرف دیکھتا رہا کہ شاید کوئی اُسے دیکھ کر بُلالے مگر کسی بھی دوست نے اُس کی طرف توجہ نہ کی۔ ناصر کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ بوجھل قدموں کے ساتھ گھر واپس آگیا۔ رات تک ناصر کو تیز بخار ہو گیا۔ ناصر کی اس حالت پر سب گھر والے پریشان ہو گئے۔ ناصر کے ابّو اب تک دو بار ڈاکٹر کو لا کر ناصر کو دکھا چکے تھے۔ اس وقت گھر کے سب لوگ ناصر کے قریب بیٹھے اُس کے پیلے پڑے ہوئے چہرے کو تشویش کے ساتھ دیکھ رہے تھے، یکایک ناصر بڑبڑایا۔

"نعیم مجھے بھی کھلا لو... کھلا لو۔ ریحان مجھ سے ناراض مت ہو..." ناصر کی امّی نے چونک کر ناصر کی طرف دیکھا۔ وہ کئی روز سے ناصر کو پریشان پریشان دیکھ رہی تھیں۔ وہ محسوس کر رہی تھیں کہ ناصر کے کئی ایسے دوست جو ہر وقت ناصر کے ساتھ گھر میں گھسے رہتے تھے وہ ناصر سے ملنے نہیں آرہے تھے۔ ناصر کی امّی اُٹھیں اور انہوں نے اشارے سے ناصر کے ابّو کو کمرے میں ایک طرف جا کر اپنے پاس بلایا اور اُن سے آہستہ لہجے میں کچھ کہا، ناصر کے ابّو نے کئی بار معنی خیز انداز میں سر ہلایا کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی اور پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ناصر کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ ناصر کو تمام رات تیز بخار رہا۔

اگلے روز صبح نو بجے کے قریب ناصر کے بخار کی شدّت میں کمی واقعہ ہو گئی اور اُس نے کراہتے ہوئے دھیرے دھیرے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ تبھی ناصر کے کمرے میں اُس کے دوست نعیم، ریحان، عدیل، قمر اور راشد داخل ہوئے۔ ناصر کو لگا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ نقاہت کے باوجود اُس نے کئی بار اپنی پلکیں جھپکیں۔ کمرے میں موجود سبھی لوگوں کے چہروں پر ہلکی ہلکی مُسکراہٹ پھیل گئی۔ اُسی لمحے کمرے کے ماحول میں سب کا پسندیدہ نغمہ گونجنے لگا۔

"دوستی ایسا ناتا"

جو سونے سے بھی مہنگا۔ جو سونے سے بھی مہنگا"

سب نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا، تو ریحان نے مسکراتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں میں چھپایا ہوا چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر سب کے سامنے کر دیا۔ ناصر کے امی ابو نے پیار سے ناصر اور اُس کے دوستوں کی جانب دیکھا۔ ناصر کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے اور اس نے لمبا سانس کھینچ کر آنکھیں موند لیں۔

ٹیلی وژن کی ایجاد

مرسلہ ارشد الہدیٰ عادل منگھو پیر کراچی

ٹیلی وژن اسکاٹ لینڈ کے ایک شخص جان لوئی جی بیرڈ نے ایجاد کیا تھا ایک دن وہ سمندر کے کنارے ٹہل رہا تھا کہ اچانک اس کے کانوں میں گانے کی آواز آئی۔ اس نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا تو پتہ چلا کہ پاس ہی ایک ہوٹل میں ریڈیو بج رہا ہے۔

اس نے سوچا کہ ہوا کی لہروں پر آواز کتنی دور تک چلی جاتی ہے۔ کیا ان لہروں پر تصویر ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں جا سکتی۔ اسے فوٹو گرافی کا شوق تھا اور وہ کئی مرتبہ تصویروں اور بجلی کے تاروں پر تجربے کر چکا تھا۔ اس نے ارادہ کر لیا۔ کہ وہ ہوا کی لہروں پر تصویریں بھیج کر رہے گا۔

اس نے اسی دِن ایک صندوق، کپڑا سینے کی چند سوئیاں، بسکٹوں کا ایک ڈبا، سائیکل کے لیمپ کا شیشہ کچھ بیٹریاں، بجلی کا ایک تار اور بہت سا موم اکٹھا کیا اس کے بعد بجلی سے چلنے والی ایک پرانی موٹر خریدی، اور اس سامان کو لے کر ایک کمرے میں بند ہو گیا۔

ایک عرصے تک وہ دِن رات اس کمرے میں تجربے کرتا رہا۔ اس نے سامنے ایک پردہ لگایا ہوا تھا۔ آخر ایک دِن اس پردے پر تصویر آ گئی۔ لیکن وہ کچھ زیادہ صاف نہ تھی اس پر بیرڈ نے زیادہ تیز روشنی استعمال کرنے کی سوچی۔ اس نے ایک ہزار بیٹریاں ایک ساتھ رکھ دیں اور کئی دِنوں کی محنت کے بعد آخر پردے پر صاف تصویریں لانے میں کامیاب ہو گیا۔

اب بیرڈ نے کئی مشہور سائنس دانوں کو اپنا یہ کارنامہ دکھایا۔ یہ سائنسدان بھی ٹیلی وژن ایجاد کرنے کی فکر میں تھے۔ انہوں نے بیرڈ سے کہا کہ تم نے میدان مار لیا ہے۔ اگلے ہی دِن برطانیہ کے تمام اخباروں میں بیرڈ کی اس حیرت انگیز ایجاد کا حال چھپ گیا۔ یہ ۱۹۲۶ء کی بات ہے۔

۳۰ دسمبر ۱۹۲۹ء کو بی بی سی لندن نے ٹیلی وژن کا جو پہلا پروگرام پیش کیا۔ اس میں بیرڈ ہی کا طریقہ استعمال کیا تھا اس کے بعد بہت سے سائنسدانوں نے ٹیلی وژن میں بہت سی اصلاحیں کیں اور بیرڈ کے طریقے سے ہٹ کر دوسرے طریقے ایجاد کئے۔ لیکن ٹیلی وژن کا باوا آدم بیرڈ ہی کو مانا جاتا ہے۔

ٹیلی وژن کا اصول یہ ہے کہ کسی چیز کے سیاہ اور سفید حصوں کو برقی فرق (مثبت اور منفی بجلی) میں

تبدیل کرکے برقی لہروں کے ذریعے فضاء میں پھیلا دیا جاتا ہے۔ وصول کرنے والا آلہ ٹیلی وژن سیٹ ان برقی فرق کو دوبارہ سیاہ اور سفید حصوں میں تبدیل کر دیتا ہے اور ہمیں ٹیلی وژن کی اسکرین پر اس چیز کی تصویر نظر آتی ہے۔

فیصلہ

عبدالغفار ——— معیار ضلع مردان

بلال اور بہادر چھٹی جماعت میں پڑھتے تھے۔ دونوں کلاس کے ہونہار طالب علم تھے۔ اور اکثر اوّل آتے تھے۔ کبھی کسی سے نہیں لڑتے۔ کھیل کے وقت کھیل اور کام کے وقت کام کیا کرتے تھے۔ دونوں ایک ہی محلّے میں رہتے تھے اس لیے اکٹھے صبح کی سیر کو جاتے اور پھر اکٹھے ہی اسکول بھی جاتے اسکول سے واپس آکر کھانا کھاتے اور کچھ وقت کے لیے کھیلتے اس کے بعد اسکول کا کام شروع کر دیتے۔

دونوں غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لیے اپنی غربت سے پریشان تھے۔ بلال تو ہر وقت اپنے خراب حالات پر کڑھتا رہتا تھا۔ وہ جب اپنے دیگر ساتھیوں کو گاڑیوں میں اسکول آتے ہوئے دیکھتا یا بعض کے ساتھ سائیکل دیکھتا تو وہ پریشان ہو جاتا۔ اور سوچتا کاش! اُن کے ابّو بھی اسی طرح دولت مند ہوتے کہ ان کے لیے کار یا کم از کم سائیکل خریدتے۔ بلال ہر وقت ان سوچوں میں گم رہتا۔

ایک دن اُس نے بہادر سے پوچھا "بہادر ...! اللہ تعالیٰ نے اگر اور لوگوں کو اتنی دولت دی ہے کہ وہ کاروں اور سائیکلوں پر اسکول آتے ہیں ... تو ہمیں کیوں دولت نہیں دی ...؟"

"دیکھو بلال ...! ہمیں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔ اس دولت کا کیا کرنا ہے جو آج ہے کل نہیں۔ سب سے بڑی دولت تو علم ہے۔ علم وہ دولت ہے، جو ہمیشہ رہتی ہے اور کبھی ختم نہیں ہوتی۔ تم نے ارسطو کا نام سُنا ہوگا۔ جو ایک یونانی فلسفی تھا۔ اگرچہ اُس کو مرے ہوئے صدیاں گزر چکی ہیں مگر اُس کے پاس جو علم تھا یہ اُس کی برکت ہے کہ اُس کا نام آج بھی زندہ ہے ...! ہمیں تو خوش ہونا چاہیئے ... کہ ہم بھی

یہ دولت حاصل کر رہے ہیں۔ ابراہام لنکن ایک بہت ہی غریب گھرانے میں پیدا ہوا لیکن وہ بعد میں امریکہ جیسے بڑے اور دولت مند ملک کا صدر بنا۔" بہادر نے حوصلہ افزائی کے انداز میں مثالیں پیش کیں۔

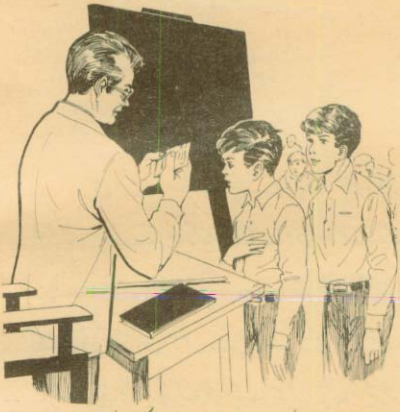

جماعت میں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ اُستاد نے سوال لکھانا شروع کیا۔ جب بلال نے قلم نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو قلم نہیں ملا۔ اُس نے اپنی ساری جیبیں دیکھیں پھر بستہ دیکھا لیکن قلم کا کچھ پتہ نہ چلا۔ اُس نے بہادر سے اس کا اضافی قلم مانگا۔ بہادر نے بستہ کھولا تو اُس کا جیومیٹری بکس بھی غائب تھا۔ دونوں پریشان ہو گئے اور انھوں نے اس چوری

کے بارے میں ماسٹر صاحب کو بتایا۔ ماسٹر صاحب نے پوری جماعت کو ہدایت کی کہ جس کے پاس بھی یہ چیزیں ہوں، وہ ان کو واپس کر دیں۔ ورنہ بعد میں جس کے پاس سے یہ سامان برآمد ہوا اُسے کڑی سزا دی جائے گی، مگر ماسٹر صاحب کی اس سخت ہدایت کے باوجود ان کے سامان کا کچھ پتہ نہ چلا۔ بالآخر ان دونوں نے فیصلہ کیا کہ اب وہ خود چور کو تلاش کریں گے۔

چھٹی کے بعد دونوں چور کو پکڑنے کی ترکیب سوچنے لگے اچانک بلال کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اگلی صبح اسکول جا کر اُس نے دو روپے کے دو نوٹ ایک قلم، جسے سیاہی میں ڈبویا گیا تھا، سب لڑکوں کے سامنے اپنے بستے میں رکھ دیا۔ جب دفقہ ختم ہوا تو سب لڑکے کلاس میں آ گئے۔ بلال نے جب دیکھا تو بستے سے قلم اور روپے غائب تھے۔ اُس نے ماسٹر صاحب سے کہا کہ اُس نے اپنا چور پکڑ لیا ہے۔

"کون ہے وہ بدبخت... ذرا اُس کا نام بتاؤ..." ماسٹر صاحب نے پوچھا۔

"سر... اگر آپ سب لڑکوں کو ایک قطار میں کھڑا کر دیں تو چور خود اپنا نام بتائے گا۔" بلال نے جواب دیا اور ماسٹر صاحب نے سب لڑکوں کو ایک قطار میں کھڑا کر دیا۔

"ہم نے اپنا چور پالیا ہے..." بلال نے مسکراتے ہوئے کہا اور کچھ توقف کے بعد بولا "چور کے ہاتھ سیاہی سے میلے ہیں۔" یہ سنتے ہی وقار نے فوراً اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔

"سر ہم... اپنے چور کو معاف کرتے ہیں..." بلال نے وقار کو ایک نظر دیکھتے ہوئے فراخ دلی سے کہا۔ یہ بات سُن کر وقار شرمندہ ہو گیا۔ جب سب لڑکے کلاس میں داخل ہوئے تو اُس نے بلال اور بہادر کو ان کا سامان واپس کرتے ہوئے کہا۔

"دوستو...! میں بہت شرمندہ ہوں... مجھے معاف کر دینا۔"

"نہیں دوست... اس میں معافی کی کیا بات ہے۔ اگر تمھیں ان چیزوں کی ضرورت ہے تو رکھ لو..." بہادر نے دوستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھو وقار...! فضول لوگوں میں اُٹھنے بیٹھنے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے اگر تم نے وقت پر فیصلہ نہیں کیا... تو تمھارا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ اب بھی وقت ہے کہ بُرے لوگوں سے بچو۔ اور اپنی تعلیم کی طرف توجہ دو۔" بلال نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

امتحانات ہو چکے تھے آج اسکول میں تقسیم انعامات کا دن تھا۔ سب لڑکے خاموش بیٹھے تھے۔ ماسٹر صاحب نے انعامات کا اعلان کیا۔ چھٹی جماعت سے اوّل بلال، دوم بہادر اور سوم نعیم آیا تھا۔ ہیڈ ماسٹر نے نمایاں کامیابی حاصل کرنے والے طلبہ کو کپ، ٹرافیاں اور نقد انعامات دیئے اور اپنی تقریر میں کہا: "عزیز طلبہ! جو لوگ محنت کرتے ہیں اللہ ان کی محنت رائیگاں نہیں کرتا۔ جن لڑکوں نے محنت کی تھی انھوں نے پوزیشن لی اور انعامات حاصل کیے۔" ہیڈ ماسٹر صاحب نے اپنی تقریر ختم کر کے انعامات جیتنے والوں کو مبارک باد دی۔

بلال اور بہادر چھٹی کے بعد گھر آ رہے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ وقار انتہائی پریشانی کے عالم میں کھڑا ہے: "کیوں بھئی وقار... کیا ہوا...؟" بہادر نے پوچھا۔

"کچھ نہیں بھائی! بس... مجھے..." وقار نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ہاں! ہاں... بولو" بلال نے اُسے ہمت دلائی۔

مجھے آج احساس ہوا کہ بُری محفلوں میں بیٹھنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ میں آئندہ کبھی بُرے لوگوں کے ساتھ نہیں

بیٹھوں گا۔۔۔ میں آوارہ گردی نہیں کروں گا۔۔۔ میں خوب محنت کروں گا اور آئندہ اوّل آؤں گا" وقار نے وعدہ کرتے ہوئے نئے عزم اور جوش و جذبے سے کہا۔

"تو پھر یہ لو تمھارا انعام۔۔۔" بلال نے کپ وقار کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لیکن کس بات کا انعام۔۔۔؟" وقار نے حیرت سے پوچھا

"بھئی۔۔۔ تم نے بُرا راستہ جو چھوڑ دیا۔۔۔" بلال نے جواب دیا اور تینوں خوشی خوشی اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔

مہنگی سوغات

مرسلہ:۔ شبنم بخاری

اپنے دیس کی خدمت کرنا
اپنے بڑوں کی عزت کرنا
ماں اور باپ کی خدمت کرنا
رب کی اپنے عبادت کرنا
چاہے دِن ہو چاہے رات
ہے ناں، یہ اک اچھی بات

حاصل علم کی دولت کرنا
اچھے کام سے رغبت کرنا
نیکی سے دامن کو بھرنا
دین کی خاطر جینا مرنا
باطل کو کر دینا مات
ہے ناں، یہ ایک اچھی بات

نظم

ہم ہیں ننھے مُنّے بچّے
نام کے سچّے کام کے پکّے

نام ہمارے جھلمل جھلمل
جیسے ہوں آکاش پہ تارے

ابّو کے ہیں ہم متوالے
امّی کی آنکھوں کے تارے

باتیں ہماری پیاری پیاری
روتے روتے ہنستے ہنستے

تختی بستہ بھاری بھاری
تھک جاتے ہیں چلتے چلتے

ربِّ زدنی علما کہہ کر
ہاتھ اُٹھے ہیں مُنّے مُنّے

مرسلہ:۔ سیّد مظہر عاصم ۔ سکھر

آؤ ملائیں ہاتھ

ماہنامہ آنکھ مچولی۔ ہمدرد فاؤنڈیشن پریس

۔۔ ڈی ۔ نورس روڈ سائٹ کراچی نمبر ۔

آؤ ملائیں ہاتھ

سلمان شکیل ۱۳ سال
جماعت ہشتم، کرکٹ کھیلنا
مضمون، سائنس ، ڈاکٹر
بن کر غریبوں کی خدمت کریں گے ۔
مکان نمبر ۹۹۔ گلی نمبر ۲۔ نیو ریلوے کالونی ۔ شاہدرہ سٹیشن لاہور

آصف الرحمٰن ۱۴ سال
جماعت نہم، کرکٹ کھیلنا
مضمون انگریزی، اُستاد
بن کر تعلیم کو فروغ دیں گے ۔
نزد فیصل فرٹیلائزر ایجنسی ۔ سرسید روڈ ۔ میر پور خاص ۔

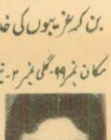

ارشاد علی ۱۳ سال
جماعت ہفتم فلمیں دیکھنا
مضمون ریاضی ، پولیس
انسپکٹر بنیں گے ۔
معرفت گل خیر علی ۔ شاہین کالونی ۔ باڑہ گیٹ ۔ پشاور صدر

عبدالسلام ۱۳ سال
جماعت ہفتم، ٹکٹ جمع کرنا
قلمی دوستی ، مضمون ،
انگریزی ۔ پائلٹ بنیں گے ۔
ملک میڈیکوز ۔ کوہاٹ

ندیم اقبال ۱۲ سال
جماعت ہفتم، کرکٹ کھیلنا
مضمون ، ریاضی، پائلٹ
بن کر قوم کی خدمت کریں گے ۔
ضلع بھالیہ ۔ ضلع گجرات ۔

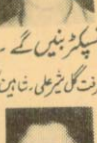

نورالاسلام سحر ۱۱ سال
جماعت ہفتم ، قلمی دوستی
مضمون، انگریزی ، ڈاکٹر
بنیں گے کیونکہ والدین کی خواہش ہے ۔
حاجی سلیمان اینڈ الیاس میڈیکل اسٹور ۔ جہلم

عارف خان ۱۰ سال
جماعت سوم، کرکٹ کھیلنا
مضمون، ریاضی ۔ فوجی
بن کر ملک کی حفاظت کریں گے ۔
ولیداد بانڈہ ۔ حضرو روڈ ۔ ضلع اٹک

محمد ندیم اختر ۱۵ سال
جماعت نہم ، قلمی دوستی
مضمون، انگریزی ، فوجی
افسر بننے کا شوق ہے ۔
القیوم آٹو اسٹور ۔ تونسہ شریف ڈیرہ غازی خان

کاشف چغتائی ۱۲ سال
جماعت ششم، آنکھ مچولی
پڑھنا ، انگریزی، حساب
پائلٹ بن کر وطن کی حفاظت کریں گے ۔
۵۶۵/۲۳ رشاہنواز بلڈنگ ۔ رحمانپورہ چوک ۔ لاہور

جمیل عزیز ، ۱۱ سال
جماعت ، ہشتم ، مشغلہ
کرکٹ کھیلنا، مضمون انگریزی
سائنس ، ڈاکٹر بننے کا شوق ہے ۔
۸۳۶/۱ ڈرگ کالونی نمبر ۱ ۔ کراچی

ارشد جاوید ۱۷ سال
سیکنڈ ایئر ، قلمی دوستی
کرکٹ ۔ مضمون، انگریزی
آرمی افسر بن کر اسلام کی خاطر لڑنے کا ارادہ ہے
مکان نمبر ۹۱ ۔ ۲۳ ۔ ۱۲ ۔ ۱۲ ۔ ۲ ۔ انک سٹی

یاسر شاہین ۱۴ سال
جماعت ہشتم ، کرکٹ کھیلنا
مضمون ، ریاضی ،
کرکٹر بنیں گے ۔
مکان نمبر ۳۶ ۔ خالد کالونی ۔ کنری ۔ ضلع تھرپارکر

علیم الرازی ۱۴ سال
جماعت ہشتم، کرکٹ کھیلنا
مضمون، اسلامیات
فوج میں شامل ہوکر قوم کی خدمت کریں گے ۔
معرفت مرزا محمد یونس ۔ علی پور چٹھہ

عباس علی شاہ ۱۲ سال
جماعت ششم، مطالعہ
مضمون، ریاضی، ڈاکٹر
بننے کا شوق ہے ۔
بی ۱۸۹ ۔ گلشن حدید ۔ بن قاسم کراچی

عبدالرحمٰن قریشی ۱۳ سال
جماعت دہم ۔ آنکھ مچولی
پڑھنا، مضمون اسلامیات
پائلٹ بن کر ملک کا دفاع کریں گے ۔
معرفت غلام حسین حجام پرانا چوک فاضل پور ۔ تحصیل وضلع راجن پور

فرید احمد، ۱۴ سال
جماعت ہشتم، اسلامی کتب
کا مطالعہ، عربی
سی ۲۰۲ ۔ نیو مظفر آباد
کالونی کراچی ۔

محمد حنیف وفا، ۱۲ سال
جماعت ششم، قلمی دوستی
مضمون، سائنس، استاد
بن کر قوم کی خدمت کریں گے ۔
دشت گوریگ ۔ ڈاکخانہ کھڈان ۔ تربت ۔ ضلع مکران

محمد اکبر عاصی ۱۵ سال
جماعت نہم، قلمی دوستی
مضمون، حیاتیات، فوج
میں شامل ہوکر وطن کی حفاظت کرنے کا ارادہ ہے ۔
ملک اشرف ٹوانہ نیر اسٹریٹ ۔ سوڈیوال ۔ بند روڈ ۔ لاہور

شرجیل احمد ۱۵ سال
جماعت دہم، تن سازی
کرنا ۔ مضمون، فزکس
فوج میں شامل ہوں گے ۔
ایچ ۶۱۵ ۔ ریلوے کالونی ۔ بروری روڈ ۔ کوئٹہ

سید مبین حیدر ۱۵ سال
جماعت ہشتم، قلمی دوستی
کرکٹ کھیلنا، مضمون
حساب، پائلٹ بننے کا ارادہ ہے ۔
محلہ بگھی پورہ ۔ ڈنگہ تحصیل کھاریاں ۔ ضلع گجرات

محمد مبین عزمی ۱۷ سال
جماعت دہم، مشغلہ
قلمی دوستی، مضمون،
انگریزی، حساب، کمشنر بنیں گے ۔
مکان نمبر ۲۸، فیز نمبر ۲ ۔ سروے نمبر ۶۹ ۔ ملیر کالونی ۔ کراچی ۳۳

سید رجب علی شاہ ۱۳ سال
جماعت ہفتم، کرکٹ
کھیلنا، مضمون اردو
بینک مینیجر بننے کا شوق ہے ۔
چک نمبر ۸/۱ آر، تحصیل میاں چنوں ۔ ضلع خانیوال

وسیم، عمر، ۱۴ سال
جماعت ششم، رسائل
پڑھنا، مضمون، انگریزی
انجینئر بن کر قوم کی خدمت کریں گے ۔
نورانی کولڈ ڈرنک ۔ سیفی لائن ۔ بغدادی ۔ کراچی

ضیاء الرحمٰن ۱۲ سال
جماعت ہفتم، شغلہ
قلمی دوستی، مضمون،
انگریزی، انجینئر بننے کا شوق ہے ۔
گورنمنٹ ہائی اسکول عثمان والا ۔

عابد انور، ۱۳ سال
جماعت ہفتم، مطالعہ
کرنا، مضمون، سائنس
ڈاکٹر بننے کا ارادہ ہے ۔
معرفت حشمت کریانہ اسٹور ۔ لانڈھی ۔ کراچی

حیدر علی، ۱۵ سال
جماعت دہم، مطالعہ
کرنا، مضمون، اردو، ڈاکٹر
بننے کا ارادہ ہے ۔
فلیٹ نمبر ۱۳ زینب بلڈنگ ۔ بلاک ۱ ۔ فیڈرل بی ایریا ۔ کراچی

شہزاد حسین ۱۶ سال
جماعت، نہم، مشغلہ
کرکٹ کھیلنا، مضمون
انگریزی، فوجی بننا چاہتے ہیں ۔
بی ۳ ۔ سعید آباد بلدیہ ٹاؤن کراچی ۔ ۵۱

طاہر ریاض ۱۳ سال
جماعت ہفتم، رسالے
پڑھنا، مضمون ریاضی
ڈاکٹر بن کر قوم کی خدمت کریں گے ۔
معرفت پروفیسر ریاض احمد ۔ وارڈ نمبر ۱۶ ۔ ننکانہ صاحب

عصمت اللہ کوبھر ۱۶ سال
جماعت دہم، کرکٹ کھیلنا
مضمون، فزکس، ڈاکٹر
بنیں گے ۔
بستی رائیس کامل کوبھر ۔ صادق آباد ۔ ضلع رحیم یار خان

محمد اصغر قریشی ۱۴ سال
جماعت دہم، قلمی دوستی
مضمون، فزکس، ڈاکٹر
بننے کا شوق ہے ۔
گورنمنٹ ہائی اسکول ۔ کندھرا ۔ ضلع سکھر تحصیل روہڑی

سلیم اقبال ۱۵ ، سال
جماعت .. قلمی دوستی
مضمون ، ریاضی
انجینئر بن کر وطن کی خدمت کریں گے ۔
کلری ۔ تحصیل و ضلع میانوالی

محسن عطا ۱۳ ، سال
جماعت ہشتم ، پَر جمع کرنا
مضمون ، سائنس، انجینئر
بننے کی خواہش ہے ۔
عباسی ہاؤس ۔ نیو سٹیلائٹ ۔ سرگودھا ۔

کاشف ریاض ۱۳، سال
جماعت ہشتم ، سکّے جمع کرنا
مضمون ، اسلامیات
ڈاکٹر بننا چاہتے ہیں ۔
۲ بی ۱۴، کینال پارک ۔ بیگم پورہ لاہور

تنویر راجپر ۔ ۱۷، سال
جماعت ، ہشتم ،
فوٹو گرافی ، مضمون ، اردو ۔
وطن کی حفاظت کے لیے کمانڈو بننا چاہتے ہیں ۔
ڈسکو فوٹو اسٹوڈیو ۔ پڈعیدن

عامر رحیم ۱۳، سال
جماعت ہفتم ، مطالعہ کرنا
مضمون ، سائنس ۔
پائلٹ بنیں گے ۔
۸۱۴ ای ایس ٹی نمبر ۷ ، ڈھوک کھبہ ۔ راولپنڈی

محمد وسیم ۱۱، سال
جماعت پنجم ، آنکھ مچولی
پڑھنا ، مضمون ، انگریزی
ڈاکٹر بن کر غریبوں کی خدمت کریں گے ۔
پی او ن ۔ میر علی بازار ۔ خیر پور

شیخ ہمایوں بشیر ، ۱۶، سال
فرسٹ ایئر ، مطالعہ کرنا
مضمون ، معاشیات ، ماہر
معاشیات بن کر معاشرے کو سنوارنے کا عزم رکھتے ہیں
مکان نمبر ۶۰۹ ۔ گوالمنڈی ۔ آنند پورہ ۔ راولپنڈی

اسرار احمد ، ۱۵، سال
جماعت نہم ، مطالعہ کرنا ، کرکٹ
کھیلنا ، انگریزی ، انجینئر
بن کر قوم کی خدمت کریں گے ۔
معرفت محمد امین ماڈل والا ۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی روڈ ۔ جیکب آباد

سنتوش کمار بجاج ، ۱۳، سال
دہم ۔ مطالعہ کرنا ، قلمی دوستی
مضمون ، کیمیا ، آنکھ مچولی
کا ایڈیٹر بننے کا ارادہ ہے ۔
معرفت سنگیت جنرل اسٹور ۔ بس اسٹاپ روڈ ہنو عاقل ۔ سکھر

کے ملک صغیر ، ۱۳، سال
دہم ، آنکھ مچولی پڑھنا
حیاتیات ، ڈاکٹر بن کر
دوسروں کی مدد کرنا چاہتے ہیں ۔
زاہد جنرل اسٹور ۔ شیہ مدرشیر ۔ بہاولپور

ایس اے جعفری ، ۱۶، سال
فرسٹ ایئر ، کہانیاں پڑھنا
کرکٹ کھیلنا ، اردو ، کرکٹ
کے شوق کی بنا پر ایمپائر بننا چاہتے ہیں ۔
معرفت ظفر نوشاہی ۔ برکی ۔ لاہور ۔

محمد اکرم سیالوی ۔ ۱۷، سال
ہشتم ، قلمی دوستی ، مطالعہ
پنجابی ، عربی ۔ اسکول کا
ہیڈ ماسٹر بننا چاہتے ہیں ۔
گورنمنٹ مڈل اسکول ۔ دکیل والا ۔ تحصیل ننکانہ صاحب

- قلمی دوستی کے اِس کالم میں صرف اسکول کے طلب شریک ہو سکتے ہیں ۔
- کوپن اور تصویر کے بغیر تعارف شائع نہیں کیا جائے گا ۔
- خراب اور نا مکمّل کوپن قابل قبول نہ ہوں گے ۔

نام ـــــــــــ عمر ـــــــ جماعت ـــــــــ
مشاغل ـــــــــ اسکول میں پسندیدہ مضمون ـــــــــ
بڑے ہو کر کیا بننا چاہتے ہیں ـــــــــ وجہ ـــــــ
پتہ ـــــــــــــــــــــــــ

امّی ابّو کا صفحہ

مظفر بیگ
مدیر ہفت روزہ آئین

خالقِ دو جہاں نے پورے نظمِ کائنات کو محبت کی بنیاد پر استوار کیا ہے
محبت ہی کو محرّک بنایا ہے اور محبت کو ہی محور۔
یہ محبت ہے جو مؤثر ہے ، یہ محبت ہے جو معیار ہے
———— اور یہ محبت ہے جس میں خالق نے نجات رکھ دی ہے

خالق کی رضا مخلوق کی طرف سے منہ پھیر کر مل سکتی تو تصویرِ کائنات کچھ اور ہوتی۔
یہاں نچھاور ہونے کی کوئی ریت نہ ہوتی ، کسی وابستگی کا کوئی جواز نہ ہوتا
ماں کو مامتا نہ ملتی ، اور راتوں کو جاگنے والی آنکھیں نہ ہوتیں ، باپ کو درد نہ ملتا
اور چوٹی سے ایڑی تک بہنے والا پسینہ نہ ہوتا ، انسان کو احساس نصیب نہ ہوتا
اور کسی زخم کے لیے کوئی مرہم نہ ہوتا ، کسی گرنے والے کا کوئی سہارا نہ ہوتا ، دُکھ درد کی پہچان نہ ہوتی
نیکی بدی کا کوئی شعور نہ ہوتا ، ———— پتھر ہوتے انسان نہ ہوتا

محبت خدا کا راستہ ہے اور نفرت اس کی نفی۔
اور اپنے ابدی مستقبل کا انتخاب خود ہمارے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے۔
یہ بھی محبت کا اعجاز ہے ، مالک کی لازوال محبت کا اعجاز

نجات چاہتے ہو ، یقیناً سب سے اچھی بات چاہتے ہو
اسے اپنے پیاروں کے لیے بھی چاہو ، یہ اس سے بھی اچھی بات ہے

معیاری خوردنی اشیاء کی پہچان
اس کے اجزاء

قدرت نے ذائقہ دیا احمد نے محفوظ کیا

REGD. No. M-266 DECEMBER 1988
MONTHLY AANKH MICHOLEE KARACHI